اور درس آموز ہوتا ہے، دور حاضر میں تہذیب و تمدن کی ترقی کے باوجود انسانی قلوب کی بے نوری اور اخلاقی قدروں کی پامالی دیکھکر سخت آزردہ ہیں اس لئے ان قطعات میں حسن اخلاص حسن عمل اور عظمت آدم کا پیام دیا ہے۔

اسرار نبوت، ہماری تعلیم کا مسئلہ ۔ مرتبہ ۔ جناب مولوی محمد شہاب الدین ندوی تقطیع خورد، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر صفحات بالترتیب ۴۸ و ۲۶ قیمت بالترتیب ۵، ۴۰ پیسے، پتہ ۔ فرقانیہ اکیڈمی ۱۶۴ پولیس روڈ، بنگلور ۲

مولوی شہاب الدین ندوی ناظم فرقانیہ اکیڈمی بنگلور بڑے زود نویس ہیں موجودہ سائنسی امور و فلکیاتی مسائل تسخیر قمر وغیرہ پر بعض کتابیں اور مضامین لکھکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں، یہ دونوں کتابچے ان ہی کے قلم سے ہیں پہلے میں نبوت کے مقاصد سائنسی نقطۂ نظر سے بیان کئے ہیں اس میں آفتاب فلکی (سورج) اور آفتاب رسالت (محمدؐ) کے خصوصیات بیان کر کے مختلف حیثیتوں سے انکی فیض رسانی وغیرہ کا ذکر ہے یہ کتابچہ بقامت کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے لیکن کہیں کہیں بلا ضرورت نامناسب طور پر انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جیسے ہمارے لئے سمندروں سے پانی بھی ٹرانسپورٹ کرتا ہے (ص ۴)، اسلامی سانچے میں ڈھلنے کی پریکٹس کرانا (ص ۲)، خوف و خشیت الہی کا ٹمپریچر بڑھ جاتا ہے (ص ۲۵) اسکے لنگ لنگ سے امید و یقین کے چشمے پھوٹنے لگتے ہیں (ص ۳۰) تلاوت (ص ۲) کو نذر لکھا ہے حکم کی جمع احکامات (ص ۲۶ و ۳۴) اور وجہ کی وجوہات (ص ۳۴) غلط ہے بہشتہ (ص ۱۴ و ۱۳) زمینی سقا کا صحیح املا بہشتی ہے، شاہد کا ترجمہ نگراں (ص ۸) بروج کا کھمت میں (ص ۸) اور یحیری کا دوڑ رہا ہے (ص) محل نظر ہے، دوسرے کتابچے میں مسلمانوں کے اس زمانہ کے اہم اور ضروری مسئلہ تعلیم کے متعلق یہ مناسب خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ عام لوگوں کیلئے تو بقدر ضرورت دینی مسائل کا جان لینا اور نئے علوم و مسائل سے کچھ نہ کچھ لگاؤ رکھنا کافی ہو مگر مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی ضرور ہونی چاہئے جو دینی و دنیوی علوم کی جامع اور ہر دو میں کمال رکھنے والی ہو اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے بعض تجویزیں پیش کی ہیں اس قسم کی تجویزیں پہلے بھی پیش کی جا چکی ہیں مگر اب قوم کے ارباب حل و عقد کو اس جانب عملی پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے محض تجویزیں قلمبند کر دینے سے یہ پیچیدہ اور نازک مسئلہ حل ہو سکتا ہے نہ امت مسلمہ کی تعمیر

جلد ۱۲۱ ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۷۷ء عدد ۲

مضامین

شذرات

آج سے دو سال پہلے ہندوستان اور پاکستان میں امیر خسرو کا سات سو سالہ جشن منایا گیا تھا جس میں دونوں ملکوں کے بین الاقوامی سمینار میں بعض محققوں اور دانشوروں نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے بھی کہ نہیں، انھوں نے مستند اور معاصر تحریروں سے اس کا ثبوت طلب کیا، جو اس وقت فراہم نہ کرنے کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ سے امیر خسرو کی ارادت ثابت نہیں کی جا سکتی ہے،

راقم کے پاس بھی کچھ ایسے خطوط موصول ہوئے کہ اگر امیر خسرو واقعی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ بیعت میں داخل تھے تو اس کو مستند حوالوں سے ثابت کیا جائے، سمینار ہی میں یہ سوال مضحکہ معلوم ہوا تھا، اور جب اس موضوع پر ابھی حال ہی میں ایک مقالہ لکھنے بیٹھا تو مذکورۂ بالا دانشوروں کا دعویٰ ایسے ہی بے سروپا معلوم ہوا جیسے کسی زمانہ میں ایک محقق نے اپنی تحقیق کا دریا بہا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہو کہ کربلا کا واقعہ پیش ہی نہیں آیا، حضرت امام حسینؓ نہ شہید ہوئے اور نہ کربلا میں مدفون ہیں، آج کل تو یہ تحقیقی مہم بھی جاری ہے کہ آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کو شاہجہاں نے نہیں بنوایا، بلکہ یہ راجپوت راجاؤں کے محلات پہلے سے تھے، بعض محققوں نے تو یہ بھی سوال اٹھایا ہے کہ کلیر شریف کے حضرت علاء الدین صابرؒ کا وجود تھا بھی کہ نہیں، ایک صاحب نے تو یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدینؒ جہاں مدفون ہیں وہ ان کا اصلی مرقد نہیں،

ایسی تحقیقات کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح بعض تلوار کے دھنی خواہ مخواہ فسادفی الارض برپا کر دیتے ہیں اسی طرح تحقیق کے بعض دھنی اپنا جوہر دکھا کر فساد فی العلم، فساد فی التاریخ، فساد فی الارادت اور فساد فی الراسخ العقیدگی برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں،

سمینار میں جن دانشوروں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے اس سے ان کی صرف تنگ نظری تحقیق کا اظہار ہوتا تھا، ورنہ اگر امیر خسرو کی مثنویاں اور تصانیف کا مطالعہ کرتے تو اس قسم کی تحقیق سے ان کی تحقیق بے معنی ہے کو نیچا نہ دکھاتے، کیونکہ امیر خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی شان میں جتنی منقبتیں کہی ہیں ان میں اپنی ارادت پر بڑا فخر کیا ہے، اپنی مثنوی مطلع الانوار میں اپنے شیخ کی جو منقبت کہی ہے اس میں پہلے پیر کی فضیلت بیان کی ہے پھر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اپنے روحانی منعم ہی کی بدولت سب کچھ حاصل کیا، اسی منقبت میں رقمطراز ہیں کہ ان کو حضرت خواجہ کی غلامی یعنی مریدی پر فخر ہے اور وہ سلسلۂ نظامی میں منسلک ہو گئے ہیں جس کے بعد ان کو کسی اور مرشد کی ضرورت نہیں،

مفتخر از دے بہ غلامی منم   خواجہ نظام ست و نظامی منم

چو نظر مرحمتش گشت یار   نیست مرا حاجت آموزگار

پھر خداوند تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ انکو حضرت خواجہ کی تعلیم پر عمل کرنے کی سعادت حاصل ہو، اور ان کو جو انوار حاصل ہوئے ہیں ان کا کچھ پرتو انکے یعنی خسرو کے دل پر بھی پڑتا رہے (علی گڑھ اڈیشن ص ۲۳-۲۰) اپنی مثنوی لیلیٰ و مجنوں میں اپنے حضرت خواجہ کا روحانی چاکر بتایا ہے (علی گڑھ اڈیشن ص ۴) آئینۂ سکندری میں جب پیر و رنعت لکھ لیتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اپنے پیغمبر پر در نثار کرتے وقت لولوئے شاہوار حاصل ہوئے تو یہ خیال آیا کہ ان موتیوں کا تحفہ اپنے پیر کی خدمت میں پیش کروں، (علی گڑھ اڈیشن ص ۱۱)

ہشت بہشت میں جو منقبت لکھی اس میں ارادت کے آداب کے مطابق اپنے کو حضرت خواجہ کا غلام بتاتے ہیں اور حشر میں انہی کے ساتھ رہنے کے خواہاں ہوتے ہیں (ص ۱۵) مثنوی دول رانی میں حمد اور نعت لکھ چکے تو کہتے ہیں کہ اب اپنے پیر کا ذکر کرتا ہے (ص ۱۵) اپنی مثنوی نہ سپہر میں دل کھول کر لکھا ہے کہ ان کو اپنے شیخ کی ارادت میں ایک عظیم پناہ مل گئی ہے اور وہ راہ مستقیم پر آ گئے ہیں، اور خوش ہیں کہ ان کو ایک دست گیر مل گیا ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ اس شاہ کا ہاتھ میرے لئے ایک کشتی بن گیا ہے جس کے بعد (تصوف کا) بحر میرے لئے کھل گیا ہے، میں اپنے پیر کے صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا ہوں، اسی لئے میں شرم سے اپنے سر کو اٹھا نہیں سکتا ہوں جب کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ میں نے ان سے جو کچھ پایا ان پر نچھاور کر دوں، (ص ۲۷)

طوالت کے خیال سے یہاں پر اشعار نہیں نقل کئے گئے ہیں، ان کے معانی دیدیئے گئے ہیں، مثنویوں کے صفحات کے حوالے سے انکی تصدیق کیجا سکتی ہے، امیر خسرو کے معاصرین میں اُن کی ارادت کی دھوم رہی، سیر الاولیا حضرت امیر خسرو اور حضرت خواجہ نظام الدین اولیا ہی کے عہد میں لکھی گئی، اس کے مصنف نے لکھا ہے کہ امیر خسرو جب بلوغ کو پہنچے تو وہ سلطان المشائخ کی ارادت کے شرف سے مشرف ہوئے، اور طرح طرح کے مخصوص مراحم و شفقت سے مخصوص کئے گئے، ان پر خاص نظر کا لحاظ رکھا جاتا تھا، انہوں نے سلطان المشائخ امیر خسرو کے نانا راوت عرض کے گھر میں رہتے تھے، جو مندہ پل کے دروازہ کے پاس تھا، اسی سلسلہ میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ امیر خسرو اپنی محبت اور اعتقاد صادق کی وجہ سے حضرت خواجہ کے محرم اسرار بھی ہوگئے تھے، (ص ۳۰۱)

تاریخ فیروز شاہی کے مصنف مولانا ضیاء الدین برنی امیر خسرو کے پیر بھائی گہرے دوست اور ہم نشیں تھے، وہ لکھتے ہیں کہ میں، امیر خسرو، امیر حسن اور میرے درمیان محبت اور یگانگت کے تعلقات رہے ہیں، وہ میرے بغیر رہ سکتے تھے اور نہ میں اُن کی ہم نشینی کے بغیر زندگی بسر کر سکتا تھا، انہی کا بیان ہے کہ امیر خسرو اپنے تمام فضل و کمال اور فن بلاغت کیساتھ مستقیم الحال صوفی بھی تھے، اُن کی عمر کا بیشتر حصہ صوم و صلوٰۃ اور قرآن خوانی میں گذرا، وہ متعدی اور لازمی عبادات میں یکساں تھے، اور ہمیشہ روزہ رکھتے تھے، وہ شیخ (نظام الدین) کے خاص مریدین میں تھے، میں نے اتنا عقیدتمند مرید کوئی اور نہیں دیکھا، عشق و محبت الٰہی سے اُن کو پورا حصہ ملا تھا، صاحب سماع اور صاحب حال و وجد تھے، (تاریخ فیروز شاہی ص ۳۵۹)

ان معاصر شہادتوں کے بعد سمینار یا کسی مقالہ میں کوئی یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید نہ تھے، تو یہ فن تحقیق کی کیسی بے دقتی ہے، راقم کو خوشی ہے، اس سلسلہ میں مطالعہ کرنے بیٹھا تو "امیر خسرو ایک صوفی کی حیثیت سے" ایک چھوٹی سی کتاب تیار ہوگئی جو جلد شائع ہوگی، اس سے ظاہر ہوگا کہ امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین رحمۃ اللہ کے صرف بہت ہی چہیتے مرید تھے، بلکہ ان سے اُن کو جو وارفتگی اور شیفتگی رہی، اس کی بدولت وہ مستقیم الحال صوفی بھی، عشقِ الٰہی میں سرشار بھی، عشقِ رسول میں مخمور بھی، صاحب معرفت بھی، صاحب حال و وجد بھی تھے،

مقالات

تقدیر امم اور علامہ اقبال رح

از
ڈاکٹر محمد ریاض تہران یونیورسٹی،

اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں اقوام و امم کے عروج و زوال کے بارے میں متعدد اہم نکتے ملتے ہیں، ان سب نکات کو یکجا کیا جائے تو ایک مبسوط کتاب بن جائے، لیکن اس وقت اس موضوع کو ایک مقالہ تک محدود کرنا ہے، تقدیر امم در اصل ایک اہم بالشان مسئلہ ہے، جس پر تاریخ اور فلسفہ عمران کا کوئی ژرف بین عالم ہی گفتگو کر سکتا ہے، تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے متعدد فلاسفہ اور مفکرین کے نام تلاش کئے جا سکتے ہیں، جنھوں نے حیات و ممات ملل کے بارہ میں بحث کی ہے ان حضرات میں علامہ ابن خلدون (م ۸۰۸ھ ۱۴۳۲ء) کا نام زیادہ مشہور رہا ہے، عصر حاضر کو ایران کے نامور شاعر ملک الشعراء محمد تقی بہار مشہدی (م ۱۹۵۱ء) نے قرن اقبال کہا ہے، اس لئے اس قرن کے اس خاص سال میں جس میں شاعر مشرق کی ولادت کو سو برس پورے ہو رہے ہیں، تقدیر امم کے سلسلے میں انکی فکر و نظر سے استفادہ کرنے کی خاص ضرورت ہے۔

قرن حاضر، خاصۂ اقبال گشت
واحدے کز صد ہزاراں برگزشت

شاعران گشتند جیش تار و مار   دیں مبارز کرد کار صد ہزار

ہیکلے شد از سخن گوئی بپا   گفت کُلُّ الصیدِ فی جوف الفرا

عالم از حجت نمی ماند تہی   فرق باشد از درم تا فربہی

اقبال کے یہاں جہان بینی کا ایک مکمل تصور موجود ہے، جسے وہ جہانبانی سے بھی مشکل قرار دیتے ہیں۔

جہانبانی سے ہے دشوار تر کار جہان بینی   جگر خوں ہو تو چشم دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

مگر یہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کی جہانبانی اور جہان بینی کے نظریات انکی حکمت دین کے تابع ہیں:۔

ولایت، بادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری   یہ سب کیا ہیں؟ فقط اک نکتۂ ایمان کی تفسیریں

اس لئے انکی دیگر تعلیمات کی طرح، تقدیر امم کے ضمن میں انکے افکار عالیہ بھی اس ایمانی بصیرت و فراست کے آئینہ دار ہیں، جس کی تعلیم قرآن مجید میں دی گئی ہے، فرماتے ہیں!

تقدیر امم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا   مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارہ

ایک دوسرے شعر میں فرماتے ہیں:۔

چو سرمہ رازی را از دیدہ فرو شستم   تقدیر امم دیدم پنہاں بہ کتاب اندر

ایک اور جگہ یوں ارشاد ہے،

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب   گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

مقصد یہ کہ تقدیر امم ہر زمانہ میں قرآن مجید سے ہویدا رہے گی مگر اسے دیکھنے کے لیے امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) کے فلسفیانہ اور کلامی مباحث اور زمخشری کی ادبی و لغوی موشگافیوں کے بجائے قلب کی جلا اور تزکیہ کی ضرورت ہے، تاکہ اس پر حقائق کا

انعکاس ہو سکے، قرآن مجید کے ان راہنما اصولوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے جنکی طرف تقدیر امم کے ضمن میں اقبال اشارہ فرماتے ہیں۔ مگر یہاں ایک دوسرے نکتے کو بھی پیش نظر رکھنا ہے کہ اسلام کے اصول و ضوابط، فطری، ازلی اور ابدی ہیں اس لیے مسلم یا غیر مسلم قوم کے ارتقا یا انحطاط کے سلسلے میں بحث کے دوران اس امر پر غور کرتا ہے کہ وہ کس حد تک خالق کائنات کے متعین کردہ اصول و قوانین کی پابند ہے، یہ بات کتنی ہی عجیب نظر آئے مگر خلاف واقعہ نہیں کہ مسلمانوں کے بہت سے کام خلاف اسلام اور غیر مسلموں کے متعدد معمولات، مطابق اسلام ہیں اس لئے مسلمان پورے طور پر اسلام پر عمل نہ کر کے مغضوب باری ہو رہے ہیں، (دیکھئے حکم صریح آیہ ۲۰۸.....) مگر غیر مسلم اسلام کے بعض اصول کو اپنانے کی وجہ سے ان کی برکتوں سے مستفیض ہو رہے ہیں، اقبال کے یہاں کافروں کی مسلم آئینی، اور نام نہاد مسلمانوں کی کفر دوستی کا ذکر کئی موقعوں پر آیا ہے کس درد سے کہتے ہیں۔

کافروں کی مسلم آئینی کا بھی نظارہ کر   اور اپنے مسلموں کی مسلم آزاری بھی دیکھ

عدل ہے فاطر ہستی کا ازل سے دستور   مسلم آئیں ہوا کافر تو ملے حور و قصور

کافر ہے مسلماں، تو نہ شاہی نہ فقیری   مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں   مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیر الٰہی

عروج و زوال ملل اقبال نے اقوام کے عروج و زوال کے بارہ میں چند قرآنی اصولوں کی طرف کئی بار اشارہ کیا ہے، جنھیں حیات اقوام، تعزیر اجتماعی، احساس ذمہ داری اور تغیر استعداد کے نام دیئے جا سکتے ہیں،

حیات اقوام مقصد یہ ہے کہ افراد کی طرح اقوام کے خاتمے کا بھی وقت مقرر ہے،

(ملاحظہ ہو آیت ۳۴ پارہ ۸) ان کی عمریں کبھی مختصر ہوتی ہیں، اور کبھی طویل۔ انفرادی جسمانی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے جس طرح مضرت رساں چیزوں سے اجتناب، قوت بخش غذا، صحت مند ماحول اور محنت و ریاضت ضروری ہے، اسی طرح اقوام و ملل کو بھی درازیٔ عمر کے لیے سخت کوشی کی عادت ڈالنے، صداقت و عدالت کو دستور العمل بنانے اور عیش پرستی سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ تن آسان اور عیش پسند قومیں جلد صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہیں، تاریخ کے اوراق ملاحظہ ہوں کہ شمشیر و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب سے دل بہلانے والوں کا انجام کیا ہوا،

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ قدیم   کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات
قسمت بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا   انگبیں جسکے جوانوں کو ہے تلخاب حیات

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود   زانکہ بر جندل گماں بردند عود

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیش جہاں کا دوام   وائے تمنائے خام، وائے تمنائے خام
میں تجھکو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے   شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اوپر کا ایک شعر مولانائے رومؒ (م ۶۷۲ ہجری) کا ہے جسے اقبال نے پیام مشرق اور بال جبریل میں تضمین کیا ہے۔ سخت کوشی و تن آسانی، حمیت اور بے حمیتی کے پیمانوں سے اقبال نے بعض اقوام کے عرصۂ حیات کو ناپا بھی ہے، بدیہی مثالیں تیموریان ہند اور ترکان عثمانی کی ہیں، پہلے خاندان نے کوئی دو سو برس تک جفاکشی اور سخت کوشی کو اپنا شعار بنائے رکھا (۱۵۲۶ تا ۱۷۰۷ء، از بابر تا اورنگ زیب) مگر اس کے بعد بالعموم تن آسانی اور بے حمیتی کا دور دورہ رہا، یہاں تک کہ انیسویں صدی عیسوی کے وسط کے چند سال بعد یہ خانوادہ ختم ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں ترکان عثمانی کی مجاہدانہ اور مبارز

قوم صدیاں گذر جانے کے باوجود سرگرم کار ہے۔ نظم غلام قادر رُہیلہ (بانگ درا) کا یہ شعر غور طلب ہے کہ

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر   حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

کہیں کہیں علامہ مرحوم تجاہل عارفانہ بھی اختیار فرماتے ہیں۔

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ   نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکان تیموری
درفش ملت عثمانیاں دوبارہ بلند   چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است

قرآنِ کریم میں کئی غلط کار اقوام کا عبرت انگیز انجام بیان کیا گیا ہے، اقوام سابق کے بڑے جرائم خدا فراموشی، شرک، بدکاری، غرور اور بد معاملگی، ان معائب میں اقوام حاضر بھی ملوث ہیں، ان مجرموں کو جلد یا بدیر اپنے اعمال بد کی سزا ملے گی۔ مسلمان بھی اس دار و گیر سے محفوظ نہیں رہیں گے مگر اقبال کا خیال ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے قصوروں کی بنا پر آلام و مصائب سے دوچار ہوتی رہے گی، مگر صفحہ ہستی سے معدوم نہیں ہوگی، کیونکہ چراغ اسلام کبھی گل نہ ہو سکے گا۔ اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔

گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد   از اجل فرمان پذیرد مثل فرد
امت مسلم ز آیات خداست   اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ است
از اجل این قوم بے پرواستے   استوار از "نحن نزلنا" ستے
ذکر قائم از قیام ذاکر است   از دوام او دوام ذاکر است
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است   از فسردن این چراغ آسودہ است

تاریخ اسلام کے مطالعے سے انھیں یہ معلوم ہوا تھا کہ متعدد ہولناک فتنوں کے

باوجود ملت اسلامیہ ہنوز بفضل اللہ موجود ہے، مگر دو تین مقام پر (جاوید نامہ فلک عطارد اور ارمغان حجاز، حضور حق) انھوں نے عصر حاضر کی مسلمان قوم کی بقا سے مایوسی کا اظہار بھی کیا ہے۔ اسوقت امت مسلمہ کا انحطاط واضح ہے، اور موجودہ مسلمان نسل کی اساسیات اسلام سے روگردانی بھی، اِلاّ ماشاء اللہ۔ اقوام و ملل کا تغیر و تبدل اللہ تعالی کے لیے مشکل نہیں، (۲۰ : ۱۴) اس لئے اقبال ایک جگہ یہ خدشہ ظاہر کرتے ہیں کہ موجودہ مسلمان شاید مٹ جائیں، اور ان کی جگہ ایک اور ملت اسلامیہ عالم ظہور میں آجائے، جو قرآن مجید کی تعلیمات پر بہتر طریقہ پہ عمل پیرا ہو۔ دوسری جگہ وہ اس ملتِ منتظر کے ظہور کی دعا فرماتے اور اس کے اوصاف اس طرح بیان کرتے ہیں۔

منزل و مقصود قرآں دیگر است　　رسم و آئینِ مسلماں دیگر است

در دلِ او آتشِ سوزندہ نیست　　مصطفیٰؐ در سینۂ او زندہ نیست

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد　　در ایاغ او نہ مے دیدم نہ درد

ملّتے می خواہد ایں دنیائے پیر　　آں کہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر

محفلِ ما بے مے و بے ساقی است　　سازِ قرآں را نوا ہا باقی است

زخمہ ما بے اثر افتد اگر　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی　　از زمان و از مکان آمد غنی

حق اگر از پیشِ ما برداردش　　پیشِ قومے دیگرے بگذاردش

از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن　　ہر زماں جانم بلرزد در بدن

ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

مسلماں ناقدست و ژندہ پوش است　　ز کارش جبرئیل اندر خروش است

بیا نقش دگر ملت بریزم　　کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است

دگر ملت کہ کارے پیش گیرد　　دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

نگردد با یکے عالم رضامند　　دو عالم را بدوشِ خویش گیرد

دگر قومے کہ ذکر لا الٰہش　　برآرد از دلِ شب صبحگاہی

شناسد منزلش را آفتابے　　کہ ریگِ کہکشان روید ز راہش

تعزیرِ اجتماعی

اس اصول کا مدعا یہ ہے کہ 'فطرت ازلی' کی نظر میں کسی ملت کا کام ایک یا چند افراد کے مقابلے میں کہیں اہم ہے۔ قرآن مجید میں ابولہب، بلعم باعوز، فرعون اور قارون جیسے چند افراد کی تعزیر و تعذیب کا ذکر آیا ہے، مگر از روئے سیاق وہاں بھی ملت کا ذکر زیادہ اہم ہے، کیونکہ افراد بہرحال اقوام کا جزو ہوتے ہیں۔ اللہ تعالی جماعت اور قوم کے کام کو برکت دیتا ہے، مگر ابلیسی خلل اندازیوں کے خدشے بھی نظر انداز نہیں کیئے جا سکتے۔ اس لیئے ملی اور قومی کاموں کے مالہٗ اور ما علیہ کو پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ سامنے رکھنا چاہیئے ورنہ اجتماعی خطائیں قابل تعزیر اور ناقابل معافی ہوتی ہیں۔

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت　　ہے خوار زمانے میں کبھی جوہرِ ذاتی

شاید کوئی منطق ہو نہاں اسکے عمل پر　　تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سبکو　　تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اسکی　　بُرّان صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اسکی

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز　　ہو نہ اخلاص تو دعوئ نظر لاف و گزاف

اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم　　ایک سازش ہے فقط دینِ مروت کے خلاف

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے — قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے — کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

یہاں ضمنی طور پر اقبال کے فرد و ملت (یعنی خودی و بیخودی) کے نظریات کی طرف اشارہ کرنا ناگزیر ہے، انکی تفصیل اسرار خودی، اور رموز بیخودی، نام کی مثنویوں میں ہے، اقبال کا یہ فلسفہ نصف صدی سے عالمگیر ہو چکا ہے، اقبال نے فرد کی تعمیر سیرت (خودی) کو قومی خدمت کے تابع رکھا ہے، (بیخودی) کیونکہ انکا محبوب فرد، روسو کا امیل، نہیں ہے، بلکہ اپنے مسلمان معاشرے کا خدمت گزار اور بہی خواہ ہے۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں، اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
در جماعت خود شکن گردد خودی — تا ز گلبرگے چمن گردد خودی

مگر اقبال کی نظر میں، قوم، کا نظریہ، سیاسیات کی کتب اور مغربی تصور قومیت سے مختلف ہے، ان کے اشعار، انگریزی خطبات (خطبہ پنجم خصوصاً) مقالات، مکاتیب اور بیانات میں اسلامی بین الاقوامیت کے علاوہ مسلمان ممالک کی انفرادی، قومیت بھی نمایاں ہے، (خطبات میں ایران اور ترک کے حوالے سے) اقبال اس معاملے میں سید جمال الدین افغانی (۱۸۹۷) کے ہم خیال ہیں جو مسلمان ممالک کے انفرادی تشخص کے حامی تھے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کے ممکن العمل اتحاد اور اشتراک کے داعی بھی، یہ نکتہ قابل ذکر ہے، کہ مسلمانوں کے تصور قوم میں، دین، ایک محور و مرکز ہے، اور دیگر معاملات اسی سے مربوط ہیں۔

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں — جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں،

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر — خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی
انکی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار — قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامنِ دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں — اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

ربط و ضبط ملت بیضا ہے مشرق کی نجات — ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو — ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے — نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر

علامۂ موصوف بجا طور پر فرماتے ہیں کہ افراد اور ملت کا رابطہ ناقابل انفصال ہے اس لیے دانا دل افراد برے دن آجانے پر ملت و قوم سے قطع روابط نہیں کرتے بلکہ خزاں کی پژمردگی کو خندۂ بہار کی آمد کے انتظار میں برداشت کرتے رہتے ہیں،

ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ — ممکن نہیں ہری ہو سحابِ بہار سے
ہے لازوال عہدِ خزاں اس کے واسطے — کچھ واسطہ نہیں ہے اسے برگ و بار سے
ہے تیرے گلستاں میں بھی فصلِ خزاں کا دور — خالی ہے جیبِ گُل زرِ کامل عیار سے
جو نغمہ زن تھے خلوتِ اوراق میں طیور — رخصت ہوئے ترے شجرِ سایہ دار سے
شاخِ بریدہ سے سبق اندوز ہو کہ تو — نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ — پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ

بالِ جبریل میں اقبال نے مولانائے رومؒ کے درج ذیل شعر کو تضمین کیا ہے، اس کا مدعا یہ ہے کہ صاحبِ دل، دردمند فرد کی دل آزاری قوم کے وبال کا موجب بن جاتی ہے (نظم پیر و مرید)

[illegible] اب مسلماں میں نہیں وہ رنگ و بو
سرد کیوں کر ہو گیا اس کا لہو

پیرِ رومی تا دلِ صاحبدلے نامد بدرد
ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد

کسی دردمند اور مخلص صاحبِ دل شخص کی بددعا کی تاثیر اور روحانیت پر ایمان رکھنے والے افراد کے لیے اچنبھے کا باعث نہیں ہو سکتی کہ بقول سعدی۔

ز آتش سوزاں نکند با سپند
آنچہ کند دودِ دلِ دردمند

مگر بالعموم اقبال نے قوم کو افراد پر حتیٰ کہ بادشاہوں پر بھی ترجیح دی ہے۔

سکندر رفت و شمشیر و علم رفت
خراجِ شہر و گنجِ کان و یم رفت

امم را از شہاں پایندہ تر داں
نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت؟

احساسِ ذمہ داری | اس اصول کا دائرہ عمل انفرادی اور اجتماعی زندگی کو محیط ہے، جدید عمرانیات و سیاسیات کے ماہر بھی اس کی اہمیت پر روشنی ڈالتے رہے ہیں، قرآن مجید میں یہ اصول بڑی سادگی کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے (ملاحظہ ہو ۱۶:۴۵۔۴۷) اور ایک کی بدعملی کسی دوسرے کے لیے باعث وبال و عذاب نہیں ہو سکتی۔ احساس ذمہ داری کے ذریعے فرد و ملت اپنے اعمال کا محاسبہ کر سکتے ہیں کہ وہ ترقی و سربلندی کے کسی معیار پر ہیں: اور ملت کی پسماندگی کے ذمہ دار کون لوگ ہیں؟ یہ خودی اور بیخودی کے ممکنات کا محاسبہ اور تجزیہ ہے؛ اور اسی کی مناسبت سے اقبال نے جوانوں اور معاشرے کے ذمہ دار و فعال افراد کے اعمال کی اس قدر تعریف کی ہے۔

اگرچہ زر بھی جہاں میں ہے قاضی الحاجات
جو فقر سے ہے میسر تونگری سے نہیں

اگر جواں ہوں میری قوم کے جسور و غیور
قلندری میری کچھ کم سکندری سے نہیں

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وہ عالمِ مجبور ہے تو عالمِ آزاد

موجوں کی تپش کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ افتاد

دگرگوں جہاں ان کے زورِ عمل سے
بڑے معرکے زندہ قوموں نے مارے

احساس ذمہ داری کا فقدان، تقدیر امم کا ایک المیہ ہے، کسی کارواں کو اگر اپنے متاع کے لٹ جانے کا احساس ہو تو امید رکھنا چاہیے کہ آئندہ وہ زیادہ محتاط رہیگا اور تلافیِ مافات کی کوشش بھی کریگا لیکن احساس ذمہ داری سے محروم افراد نہ احتیاط برتینگے نہ تلافی کی فکر کریں گے۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

ایک قطعہ "گلہ" میں (ضربِ کلیم) اقبال برصغیر کے باشندوں سے گلہ و شکوہ کرتے ہیں کہ ان کے احساس ذمہ داری کے فقدان نے اس سرزمین کو انگریزوں کا غلام بنا رکھا ہے۔ انکا یہ شکوہ کتنا صحیح تھا!

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بیچارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے، یورپ سے نہیں ہے

احساس ذمہ داری اور احساس جوابدہی ایک تصویر کے دو رخ ہیں خصوصاً اقبال کے دلخواہ معاشرے میں (ایک مسلمان معاشرے میں) حاکم، ملت کے خادم ہوتے ہیں، انھیں خدا کے سامنے جوابدہی کا احساس تو ہونا ہی چاہیے، مگر وہ افرادِ ملت کے سامنے بھی

جواب دہ ہوتے ہیں۔ تاریخ اسلام کے کئی ادوار میں ایسے حکمرانوں کی مثالیں موجود ہیں جو حکمرانہ نہیں بلکہ خادمانہ انداز رکھتے تھے، ان کی درویشانہ زندگی سب کے سامنے تھی اور وہ خدمت اور جواب دہی کی دعوت دیتے رہے ہیں، اقبال نے کئی مواقع پر ایسے حکمرانوں کی مثالیں دی ہیں جیسے!

سروری در دین ما خدمت گری است　　عدل فاروقؓ و فقر حیدریؓ است

قائد ملت شہنشاہ مراد　　تیغ او را برق و تندر خانہ زاد

ہم فقیرے ہم شہ گردوں فرے　　اردشیرے با روانِ بوذرؓے

غرق بودش در زرہ بالا و دوش　　در میان سینہ دل موئینہ پوش

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند　　در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند　　مثل سلمانؓ در مدائن بودہ اند

حکمرانے بود و سامانے نداشت　　دست او جز تیغ و قرآنے نداشت (پ، م)

طبع روشن مرد حق را آبرو ست　　خدمت خلق خدا مقصود او ست

خدمت از رسم و رہ پیغمبری است　　مرد خدمت خواستن سوداگری است

اصول تغیر (تغیر استعداد) قرآن مجید کا وہ اہم اصول ہے جسے تقدیر امم میں بے حد اہمیت حاصل ہے اور اقبال نے اسے بڑی تفصیل سے بیان فرمایا ہے، اس اصول کے ایک حصہ کو جدید علم سیاست کی رو سے، ذہنی کشادہ اور روشن فکری کہہ سکتے ہیں اسلامی اجتہاد بھی یہی ہے۔ اجتہاد میں قرآن و سنت اور اجماع کی روشنی میں قیاس سے کام لیتے ہوئے علمائے نئے مسائل کا اسلامی تعلیمات سے انطباق کرتے ہیں۔ اصول تغیر کے دوسرے حصے کو سرنوشت یا تقدیر کہتے ہیں، اختصار سے یوں کہہ سکتے ہیں کہ

اقبال نئے مسائل حیات کا مردانہ سامنا کرنے کی دعوت دیتے ہیں، نیز تقدیر شکنی اور تغیر تقادیر کے نکتے سمجھاتے ہیں۔

آئین نو سے ڈرنا، طرز کہن پہ اڑنا　　منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں (ب د)

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا　　جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے

وہ قوم نہیں لائق ہنگامۂ فردا　　جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے (ض ک)

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں　　ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی (ب ج)

پابندیٔ تقدیر کہ پابندیٔ احکام؟　　یہ مسئلہ مشکل نہیں اے مرد خردمند

اک آن میں سو بار بدل جاتی ہے تقدیر　　ہے اس کا مقلد ابھی ناخوش ابھی خرسند

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات　　مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

قرآن مجید میں کوشش و عمل کو بے حد اہمیت دی گئی ہے، (۳۹ | ۵۳) اس کے نزدیک افراد و ملل کی حالت میں تغیر و تبدل کے بغیر ان کی تقدیر نہیں بدلتی (۱۳ | ۱۱) سورۂ رعد کی اس آیت کی (جسے اقبال نے دیباچۂ پیام مشرق میں نقل کیا ہے) مثبت و منفی تعبیرات ممکن ہیں۔ افراد یا ملل کی سرنوشت متعین نہیں ہے، ضمیر کی تطہیر اور عمل کی تصحیح سے قوموں کی زندگی بدل جاتی ہے، افراد یا اقوام کی صلاحیت و استعداد کی بہتری سے انکا مقدر بہتر ہو جاتا ہے، اور استعداد کی خامی اور صلاحیت کے نقص کی وجہ سے ان کی سرنوشت بھی زشت اور حوصلہ شکن صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔ ان ہی اثباتی معانی میں اقبال صدق و مروت کو اپنا معمول بنانے والی اقوام کی اجتہادی غلطیوں کو قابل معافی سمجھتے ہیں اور انکی تقدیر کو منقلب اور متغیر قرار دیتے ہیں۔

نشان یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا　　کہ صبح و شام بدلتی ہیں انکی تقدیریں

کمال صدق و مروت ہے زندگی انکی — معاف کرتی ہے فطرت بھی انکی تقصیریں

قلندرانہ ادائیں سکندرانہ جلال — یہ امتیں ہیں جہاں میں برہنہ شمشیریں

علامہ مرحوم نے نثر میں ان خیالات کو اس طرح قلمبند کیا ہے۔

"مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو، اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی، جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے، اور میں نے اپنی فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔" (دیباچہ پیام مشرق)

اقبال کی یہ تحریر تقریباً ۱۹۲۳ء کی ہے، یہ صحیح ہے کہ انفس میں تغیر و انقلاب لانے اور توکل، تدبیر و تقدیر نیز قناعت کے تازہ معانی بیان کرنے کا کام اقبال نے زیادہ اپنی فارسی کتابوں کے ذریعہ انجام دیا، مگر ان کی اردو شاعری اور اردو و انگریزی تحریریں بھی ان معانی و مطالب سے خالی نہیں ہیں۔ فارسی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر — تہ این گنبد گرداں رہے ہست

اگر باور نداری، خیز و دریاب — کہ چوں پا وا کنی جولانگہے ہست

نالیدی و تقدیر ہماں است کہ بود است — آں حلقۂ زنجیر ہماں است کہ بود است

نومید مشو نالہ کشیدن دگر آموز۔

گر زیک تقدیر خوں گردد جگر — خواہ از حق حکم تقدیر دگر

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست — زانکہ تقدیرات حق لاانتہاست

ارضیاں نقد خودی در باختند — نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بحرفے مضمر است — تو اگر دیگر شوی او دیگر است

شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست — قلزمی؟ پایندگی تقدیر تست

نوع دیگر ہیں جہاں دیگر شود — این زمین و آسماں دیگر شود (ج ن)

بعض دیگر اکابر ملت کی طرح اقبال نے مسئلۂ جبر و اختیار یا تقدیر مقید و آزاد پر کافی لکھا ہے۔ ان کے نزدیک انسان اپنے سرنوشت ساز اعمال میں آزاد ہے، مگر اطاعت خدا اس کی آزادی میں اضافے کا موجب بنتی ہے، وہ جس حد تک خدا کا مطیع ہو گا خدائی قوتیں اسی قدر اس کی معاون و مطیع ہوں گی۔ شیخ سعدیؒ نے بوستاں میں کہا تھا،

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ — کہ گردن نپیچد ز حکم تو ہیچ

اقبال اس بات کو یوں فرماتے ہیں (مثنوی اسرار خودی، اطاعت مرحلۂ اول خودی،)

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

ناکس از فرماں پذیری کس شود — آتش ار باشد ز طغیاں خس شود

شکوہ سنج سختی آئیں مشو — از حدود مصطفےٰ بیروں مرو

اقبال نے قناعت اور توکل کے عرف عام کے معانی قبول نہیں کئے۔ ان کے نزدیک جبر و قدر کے بارے میں راہ وسط اختیار کرنا ہی معقول روش ہے، ہمیں اپنی

ممکن استعداد سے کام کرنا چاہیئے ، مگر اس کے ساتھ کامیابی کے لیے خدا سے استعانت اور استمداد کرنا بھی صحیح ہے ، توکل و قناعت یہی ہے ، بے عملی و بے کاری نہ توکل و قناعت ہے نہ تقدیر سے مربوط ہے ۔ ؛

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم　　جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز　　تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب ، بتدریج وہی خوب ہوا　　کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر
(ضربِ کلیم)

غلام قوموں کے علم و عرفاں کی ہے یہی رمزِ آشکارا　　زمیں اگر تنگ ہے تو کیا ہے فضائے گردوں ہے بیکرانہ
خبر نہیں کیا ہے نام اسکا خدا فریبی کہ خود فریبی　　عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ

تقدیر ہے اک نام مکافاتِ عمل کا　　دیتے ہیں یہ پیغام خدایانِ ہمالہ

جاوید نامہ (فلکِ مشتری) میں اقبال فرماتے ہیں کہ مردِ مومن خوشنودیٔ خدا کے کام انجام دیتا ہے ، اور خدا بھی اس کے دل خواہ کاموں کی تکمیل میں اس کی مدد کرتا ہے ، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کارناموں کے بارے میں غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ آخر ان کے کام محدود و ناممکل کیوں نہ رہے ؟ چنانچہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بن ولید نے کسی جنگ میں شکست نہیں کھائی تھی ، حقیقت یہ ہے کہ مردِ مومن کی تدبیر ، ہمیشہ تقدیر کی شریک و دمساز ہوتی ہے ؛

هر که از تقدیر دارد ساز و برگ　　لرزد از نیروی او ابلیس و مرگ
جبر دین مرد صاحب همت است　　جبر مردان از کمال قوت است
پخته مردی پخته تر گردد ز جبر　　جبر مرد خام را آغوش قبر
جبر خالد رضی اللہ عنہ عالمی برهم زند　　جبر ما بیخ و بن ما بر کند
کار مردان است تسلیم و رضا　　بر ضعیفان راست ناید این قبا

معنیِ تقدیر کم فهمیدهٔ　　نے خودی را نے خدا را دیدهٔ
مرد مومن با خدا دارد نیاز　　با تو ما سازیم ، تو با ما بساز
عزم او خلاق تقدیر حق است　　روز هیجا ، تیر او تیر حق است

اس ضمن میں بالِ جبریل ، کا درج ذیل شعر ، شاعر کے بیان کا ایک نمایاں اعجاز ہے ،

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے　　خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

ذیل کے اردو اشعار اسی سیاق میں ہیں ۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی　　کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا
خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ　　خودی کے سوز سے روشن ہیں امتوں کے چراغ

مگر مجھے اعتراف ہے کہ "چشمِ سرمہ سا" میں تقدیر کی گہرائیاں نظر آنے کی بات سمجھی نہیں جا سکی :-

نظر آئیں مجھے تقدیر کی گہرائیاں اس میں　　نہ پوچھ اے ہمنشیں مجھ سے وہ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

مندرجہ بالا چار اصولوں کے علاوہ اور بھی کئی ایسے اصول تصانیفِ اقبال میں جابجا پائے جاتے ہیں ۔ جو حکمتِ قرآنی سے ماخوذ و مستنیر ہیں ، اور تقدیرِ امم سے ان کا گہرا تعلق ہے ، ہم انھیں اجمالاً بیان کرتے ہوئے مسلمانوں کے موجودہ زوال و انحطاط کے بارے میں اقبال کے افکار کی طرف اشارہ کریںگے ، اسی کے ضمن میں بعض اور امور کا ذکر بھی آجائے گا ۔

عروجِ امم کے وسائل

اقبال کے نزدیک انفرادی عروج ، خودی ہے ، اور عروجِ امم ، بیخودی ۔ ان کے نزدیک عروجِ امم کے کئی وسائل ہیں ، مگر قوتِ یقین حق کی نظام

نظامِ تعلیم، جوشِ کردار، اور فکر و عمل کی جدت، غالباً ان وسائل میں اہم ترین یقین، عقیدہ و عمل کی غیر متذبذب اور پائدار قوت ہے، اور تقدیرِ امم میں اسکی بے حد اہمیت ہے،

دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیرِ امم ہے وہ قوت کہ حریف اسکی نہیں عقلِ حکیم
ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اسکی کبھی شمشیرِ محمدؐ ہے کبھی چوبِ کلیمؑ

دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اقبال کا یقین، قرآن مجید میں مذکور، ایمان کے مرادف ہے اس کا عمل بلکہ سخت کوشی کے ساتھ گہرا رابطہ ہے۔ اقبال نے اپنے انگریزی خطبات کے دیباچہ میں اس قرآنی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے، یقین کی تعریف میں ان کے متعدد اشعار اس بے یقین عصر میں ایمان آفریں ہیں،

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا
یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
یقین پیدا کر اے غافل یقین سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
یقین، مثلِ خلیلؑ آتش نشینی یقین، اللہ مستی، خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

مقامِ شوق بے صدق و یقین نیست یقین بے صحبتِ روح الامینؑ نیست
گر از صدق و یقین داری نصیبے قدم بیباک نہ کس در کمیں نیست
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کے تعلیمی افکار پر بہت لکھا جا چکا ہے، انھوں نے عام تبصروں اور اساتذہ یا مدارس کے انتقاد کے پردے میں یہ بات روشن کی ہے کہ تعلیم کا منشا صاحبِ شخصیت افراد کی تیاری اور امم غیور کی تشکیل ہے،

جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل دنیا تو ملی، طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیِ افراد ہے باقی دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی ظاہر ہے کہ انجامِ گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اسکو پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
(ب د)

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندانِ مکتب سے سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا
گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ
(ب ج)

چو می بینی کہ رہزن کارواں گشت چہ پرسی کاروانے را چساں گشت
مباش ایمن ازاں علمے کہ خوانی کہ از وے روحِ قومی می تواں کشت

جوشِ کردار، اور جدتِ فکر و عمل کے بارے میں بالترتیب اقبال نے نپولین (م ۱۸۲۱ء) اور مسولینی (م ۱۹۴۵ء) کے طرزِ عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ مرحوم تیسری گول میز کانفرنس کے اختتام پر فرانس اور اٹلی سے گذرے تھے، وہاں نپولین کی قبر دیکھ کر اور مسولینی سے ملاقات کر کے انھوں نے اپنے جو تاثرات بیان کیے ہیں، وہ بالِ جبریل کی دو نظموں کی صورت

میں دیکھے جا سکتے ہیں، یاد رہے کہ نپولین یا مسولینی اقبال کے نقطۂ نظر سے کوئی مثالی حکمراں نہ تھے، بلکہ موخرالذکر پر بعد میں انھوں نے تنقید بھی کی تھی مگر دوسروں کے اچھے اوصاف کی تعریف کرنے میں اقبال نے کبھی بخل سے کام نہیں لیا ہے،

راز ہے، راز ہے، تقدیر جہان تگ و تاز — جوش کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز
جوش کردار سے شمشیر سکندر کا طلوع — کوہ الوند ہوا جس کی حرارت سے گداز
جوش کردار سے تیمور کا سیل ہمہ گیر — سیل کے سامنے کیا شے ہے نشیب اور فراز
صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر — جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز

ندرت فکر وعمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب — ندرت فکر وعمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب
ندرت فکر وعمل سے معجزات زندگی — ندرت فکر وعمل سے سنگ خارا لعل ناب

بانگ درا کا ایک قطعہ ارتقا "جس میں اقبال مسلمانان عرب کی مبارزت آمیز زندگی کی مثال دیتے ہیں، اس ضمن میں اور بھی معنی خیز ہے، اس کا آخری فارسی شعر فرج تبریزی (گیارہویں صدی ہجری کے ایک ایرانی شاعر، مقیم حیدرآباد دکن) کا ہے،

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز — چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز — سرشت اس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی — ہزار مرحلہ ہائے فغان نیم شبی
کشا کش زم و گرما تپ تراش و خراش — ز خاک تیرہ دروں تا بہ شیشۂ حلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید — میان قطرۂ نیساں و آتش عنبی
اسی کشاکش پیہم سے زندہ ہیں اقوام — یہی ہے راز تب و تاب ملت عربی
"مغاں کہ دانۂ انگور آب می سازند — ستارہ می شکنند، آفتاب می سازند"

(باقی)

مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و ادبی خدمات

از

عشرت افروز، ایم۔اے، کراچی،

"یہ مقالہ عشرت افروز نے ڈاکٹر محمود الٰہی صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی کی فرمائش پر اس وقت لکھا تھا، جب وہ ایم اے کی طالبہ تھیں، مضمون اچھا معلوم ہوا، اس لئے قارئین معارف کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے، اب وہ اپنے شوہر ڈاکٹر راشد مصطفےٰ ام۔بی۔بی۔اس کے ساتھ کراچی میں ہیں" (معارف)

ابتدائی تعلیم مولانا سید سلیمان ندوی کی ولادت باسعادت ۱۸۸۴ء (مطابق ۱۳۰۲ھ) میں صوبہ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں ہوئی، جو پٹنہ سے ۴۲ میل، اور قصبہ بہار شریف سے ۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہ گاؤں ۱۹۴۷ء سے پہلے بڑا مردم خیز سمجھا جاتا تھا، یہاں کے ہر گھر میں انگریزی اور عربی تعلیم کا رواج تھا، سید صاحب قبلہ نے ابتدائی تعلیم اپنے بڑے بھائی مولوی ابو حبیب سے پائی، اس کے بعد مزید تعلیم کے لئے پھلواری شریف ضلع پٹنہ بھیج دیئے گئے، جہاں کی صحبتوں میں علم و ادب کا شوق پیدا ہوا، یہاں کے قیام کے زمانے میں مولانا عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناولوں کا مطالعہ دلچسپی سے کرتے رہے، خود ہی فرماتے ہیں:۔

"سب سے پہلے مولانا عبد الحلیم شرر کا ناول منصور موہنا پڑھا، اور جب کتاب ختم ہوئی تو خوب پھوٹ پھوٹ کر رو دیا، (حیات سلیمان مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی ص ۸)

ابتدائی مضمون نگاری

پھلواری شریف میں بعض اسباب کی بنا پر ان کی تعلیم کا سلسلہ صرف ایک ہی سال رہا۔ وہاں سے دربھنگہ تشریف لے گئے، داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ ایک تحریر تعلیم نسواں کے عنوان سے لکھی، جو اس قدر پسند کی گئی کہ اس زمانہ کے صوبہ بہار کے مقبول اخبار اپنچ میں چھپنے کے لئے بھیجی گئی، اپنچ پٹنہ سے مولوی عبدالرحیم کی ادارت میں نکلتا تھا، اور یہ انگریزی اخبار لندن پنچ کے طرز پر جاری کیا گیا تھا، اور زیادہ تر مزاحیہ انداز میں سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی خرابیوں کا سدِباب کرتا تھا، رفتہ رفتہ اس کی اشاعت اتنی بڑھ گئی تھی کہ سنجیدہ مقالہ نگاروں کا بھی جولانگاہ بن گیا تھا، اور اس کے ذریعہ سے صوبہ بہار میں بہت سے ہونہار مضمون نگار پیدا ہوتے رہے،

سنہ ۱۹۰۱ء میں سید صاحب اعلیٰ عربی تعلیم کے لئے دارالعلوم ندوہ میں داخل ہوئے، لکھنؤ کی سرزمین میں انکی ادبی و علمی نشو و نما خوب ہوئی، ان کو علم و ادب کا ذوق فطری تھا، اسلئے لکھنؤ کی طالب علمی کے زمانہ ہی میں اُن کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، تو اس وقت اُن کی نظر لاہور کے مشہور رسالہ "مخزن" کی طرف اٹھی، مخزن کے ابتدائی دور کے مضمون نگاروں اور شاعروں میں شیخ محمد اقبال (جو آگے چل کر اسلامی دنیا کے مایۂ ناز شاعر ہوئے) ظفر علی خاں سید سجاد حیدر، حافظ سید فضل حق آزاد عظیم آبادی، چودھری خوشی محمد ناظر، حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق، منشی نادر علی خاں صاحب کاکوروی، میر غلام بھیک نیرنگ، لالہ سری رام، منشی دیا نرائن نگم پنڈت شیونرائن شمیم وغیرہ تھے، یہ تمام اصحاب قلم مخزن کے افق پر ستارے بنکر نمودار ہوئے مگر آگے چل کر اردو ادب کے مہر و ماہ بنکر چمکے، مولانا سید سلیمان بھی ان لوگوں کی صف میں آ کھڑے ہوئے، اور اس رسالہ میں "وقت" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا، اس رسالہ میں اُن کا مقالہ چھپا، تو اُن کی ہمت افزائی ہوئی، تو پھر اس زمانہ کے دوسرے مشہور اور مقبول رسالہ علی گڑھ منتھلی میگزین میں طبع آزمائی کی، یہ رسالہ گو محمڈن انگلو اورینٹل کالج کا ایک ماہوار رسالہ تھا، مگر اس کے علمی و ادبی مضامین کی وجہ سے اس کی مانگ تمام ہندوستان میں تھی، اس میں سید صاحب کا ایک مضمون علم اور اسلام کے عنوان سے چھپا، (حیات سلیمان ص ۱۷)

ندوہ میں طلبہ مشاعرے بھی کیا کرتے تھے کبھی کبھی شہر میں بھی مشاعرے ہوتے، سید صاحب ان میں شرکت کرتے تھے، وہ اس زمانہ میں امیر مینائی کے کلام سے متاثر تھے، ان کا دیوان مرآۃ الغیب برابر مطالعہ میں رکھتے، جب کبھی طالب علمانہ انداز میں غزل کہتے تو امیر مینائی ہی کے رنگ میں کہتے، ان کا ایک شعر یہ ہے،

سر سے قدم تلک ہے ردائے حیا پڑی — حاجت ہی کیا ہے آپ کو صاحب نقاب کی

(حیات سلیمان ص ۱۸)

"ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات"، سید صاحب موصوف نے نہ صرف اپنی مضمون نگاری سے ارباب علم کو اپنی طرف متوجہ کیا، بلکہ دارالعلوم ندوہ کے اساتذہ اور ارباب حل و عقد بھی اُن کے روشن مستقبل سے پُر امید ہو رہے تھے، اس زمانہ میں شاہ سلیمان پھلواروی کی نمایاں حیثیت تھی، وہ ندوۃ العلماء سے بھی دلچسپی لیتے رہتے تھے، ان کی جوہر شناس نظروں نے سید صاحب موصوف کے علمی مستقبل کو صحیح طور سے پرکھا، خود سید صاحب معارف کے شذرات (جولائی ۱۹۳۵ء) میں مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات پر ماتم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے ساتھ مرحوم کے گوناگوں تعلقات تھے، مجھے اپنے عزیز سے کم نہیں سمجھتے تھے، میرے والد مرحوم ان کے ہم پیر اور اُن کے خسر کے مسترشد تھے، میرے بھائی مرحوم طب میں اُن کے شاگرد تھے، میں نے بچپن میں پھلواری کے قیام کے زمانہ میں اُن سے ابتدائی منطق کے دو چار سبق پڑھے تھے، وہ جب ۱۹۰۲ء میں ندوہ کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے تھے، اور مستقل قیام ندوہ میں اختیار فرمایا تھا، تو اُن کی بزرگانہ عنایات

اور حوصلہ افزائیوں نے میری علمی ترقیوں میں مدد دی، یاد ہے کہ اس زمانہ میں نواب
محسن الملک مرحوم دار العلوم ندوہ کے معاینہ کے لئے تشریف لائے تھے، شاہ صاحب
نے مجھے اور میرے ہم درس مولانا ظہور احمد صاحب وحشتی شاہجہانپوری کو امتحاناً
پیش فرمایا تھا، میں نے نواب صاحب کے خیر مقدم میں عربی میں ایک قصیدہ لکھا تھا،
شاہ صاحب نے یہ کہکر مجھے پیش کیا کہ یہ میرے عزیز ہیں، اور آپ کو اپنا قصیدہ سنائیںگے،
نواب صاحب نے فراخاً فرمایا، کہ یہ جب آپ کے عزیز ہیں تو میں اُن کا امتحان نہیں
لوں گا کہ امتحان سے پہلے ہی اُن پر ایمان لاچکا، شاہ صاحب نے فرمایا، یہ میرے
ہم نام بھی ہیں، نواب صاحب نے فرمایا تو اور بھی یہ امتحان سے بالاتر ہیں، میں نے
اپنا قصیدہ پڑھا جو افسوس ہے کہ اب موجود نہیں، تو نواب صاحب نے فرمایا کہ میں
تو اس پرانی ادب دانی کا قائل نہیں، عربی کا کوئی اخبار منگوائیے، اس کو یہ
پڑھیں، تو البتہ، اس زمانہ میں اللواء اور المؤید عربی کے مشہور اخبار تھے،
وہ منگوائے گئے، اور میں نے ان کو پڑھا، اور صحیح ترجمہ کیا، تو بے حد خوش ہوئے،
شاہ صاحب بھی بیحد محظوظ ہوئے، اور اس زمانہ کے اخبارات وکیل، وطن اور
کرزن گزٹ میں نواب صاحب کے اس معاینہ کی جو کیفیت چھپوائی، اس میں میرا
ذکر خاص طور سے فرمایا، یہ اخبارات میں میرا پہلا ذکر تھا، ان کی اس تحریر میں
ایک نقرہ یہ بھی تھا، کہ ملک و ملت کی خدمت کے لئے انشاء اللہ صوبہ بہار سرود
میں ایک سلیمان پیش کرتا رہے گا، رحمہ اللہ

مولانا شبلی کی علمی و ادبی خصوصیات

یہ پیشین گوئی بالکل صحیح ثابت ہوئی، ۱۹۰۵ء میں علامہ
شبلی نعمانیؒ دار العلوم ندوہ کے معتمد ہو کر لکھنؤ آئے، تو انھوں نے سید صاحب موصوف کو اپنے دامن تربیت

میں لے لیا، اس وقت تک علامہ شبلی مرحوم مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم" (۱۸۸۷ء) المامون (۱۸۸۹ء)
سیرۃ النعمان (۱۸۹۱ء) کلیات فارسی (۱۸۹۳ء) سفرنامہ مصر و شام (۱۸۹۴ء) رسائل شبلی (۱۸۹۸ء)
الفاروق (۱۸۹۹ء) الغزالی (۱۹۰۲ء) علم الکلام (مارچ ۱۹۰۳ء) الکلام (۱۹۰۴ء) سوانح
مولانائے روم (۱۹۰۴ء) کے مصنف بن چکے تھے، اسی زمانہ میں موازنۂ انیس و دبیر بھی لکھی جا چکی
تھی، گو شائع نہیں ہوئی تھی، ان کتابوں کی اشاعت سے وہ ایک شاعرِ شیریں مقال، جلیل القدر
مورخ، اعلیٰ ناقد اور بے مثل ادیب کی حیثیت سے غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل کر چکے
تھے، ان کا سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ ایک خاص قسم کے طرزِ انشاء کے موجد تھے، سرسید
مرحوم اُن کے طرزِ تحریر پر مبارکباد دیتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ تو لکھنؤ اور دلی کے لئے
باعثِ رشک ہیں، المامون کے دیباچہ میں سرسید مرحوم رقمطراز ہیں:

"یہ کتاب اردو زبان میں لکھی گئی ہے، اور ایسی صاف و شستہ اور برجستہ عبارت ہے
کہ دلی والوں کو بھی اس پر رشک آتا ہوگا، .... ہمارے لائق مصنف (مولانا شبلی)
نے اس کا بہت کچھ خیال رکھا ہے اور باوجود تاریخانہ مضمون ہونے کے ایسی خوبی سے اس کو
ادا کیا ہے کہ عبارت بھی فصیح اور دلچسپ ہے، اور تاریخانہ اصلیت بدستور اپنی اصل صورت
پر موجود ہے، جو خوبصورت ہے، خوبصورت ہے، جو بھونڈی ہے بھونڈی ہے، نہ
خوبصورتی کو زیادہ خوبصورت بنایا ہے، اور نہ بھونڈے پن کو زیادہ بھونڈا، اور درحقیقت
یہی کمال تاریخ نویسی کا ہے"

(دیباچہ المامون، افضل المطابع دہلی، ص ۲-۳)

مولانا حالی بھی علامہ شبلی کے طرزِ انشاء اور اسلوب بیان کے معترف تھے، وہ اُن کی
تصنیفات کو بہت شوق سے پڑھتے تھے، چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"آپ کی تصنیفات کی نسبت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ من عرف
هنز لتکوفی التصنیف کل لسانہ آپ کا وجود قوم کے لئے باعث فخر ہے خدا
تعالیٰ آپ کو بہت مدت تک زندہ و سلامت رکھے"

(حیات شبلی ص ۵ - ۸۰۴)

بعد کے ارباب بصیرت نے علامہ شبلیؒ کی انشا پردازی کی داد حسب ذیل الفاظ میں کیا خوب دی ہے:-

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی اردوے خاصہ کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں، آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔"

(افادات مہدی ص ۱۰۸)

علامہ شبلی نہ صرف اپنی انشا کی فصاحت، بلاغت، صفائی، شستگی، اور پاکیزگی کے لئے ممتاز ہوئے، بلکہ اپنے علم کی جامعیت کے لحاظ سے بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں کہ

"مولانا شبلیؒ اپنے زمانہ کے مشہور ترین و قابل ترین بزرگوں میں تھے، نہایت کثیر الاشواق، اور جامع الاذواق تھے، اگر کوئی شخص ایک شاعر، فلسفی، مورخ، ناقد، ماہر تعلیم، معلم، واعظ، رفارمر، جریدہ نگار، فقیہ، محدث، سب کچھ ہو سکتا ہے تو وہ مولانا ہی کی ذات تھی، کہ انھوں نے ان سب کمالات مختلفہ، اور علوم صحیحہ و فنون متنوعہ کا اپنی ذات میں اجتماع کر لیا تھا، اور اس شعر کے صحیح مصداق بن گئے"

ولیس للہ بمستنکر ان یجمع العالم فی العالم (حصہ دوم ص ۶۵)

کثیر الاشواق اور جامع الاذواق ہونے کے باوجود علامہ شبلی نے تصنیف و تالیف کے بلند نمونے اور تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار کو کسی حال میں نہیں چھوڑا، چنانچہ ایک جرمن مستشرق لکھتا ہے کہ

اہل مغرب کے محققانہ اور عالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی ہندوستانی تصانیف تحقیق و تدقیق کا پایہ رکھتی ہیں، تو وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں، گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوئے ہیں"

محمد یحییٰ تنہا سیر المصنفین جلد دوم ص ۲۵۴ میں لکھتے ہیں:-

"بلاشبہ مولانا شبلی کی تصانیف بلحاظ عالمانہ استدلال و انداز کسی مستند یورپی تصنیف سے کم نہیں، آپ کی کتابوں کی سب سے بڑی خصوصیت مضبوط علمی رائے اور منطقی استدلال ہے، ان میں ایک قسم کی جدت بھی ہے، اور طرز ادا میں دلآویزی اور عام فہمی کا خیال ملحوظ رکھا گیا ہے، عالمانہ عبور، غور و خوض کی قوت، تجسس، درایت، علمی جانچ پڑتال کی عادت، اپنی طبیعت سے کسی نتیجہ پر پہنچنا، پیچیدہ مسئلہ کو تیرہ و تاریک جھاڑیوں اور خارستان سے نکال کر سلجھانا اور تقسیم و تحلیل کرنا، بعد ازاں ان سے ایسے طور سے ترتیب دینا کہ وہ شے اپنی اصلی حالت میں نظر آنے لگے، یہ وہ باتیں ہیں جو مولانا شبلی کو درجۂ امتیاز بخشتی ہیں، اسی کے ساتھ مولانا مرحوم میں ایک عجیب خوبی یہ ہے کہ قدیم و جدید میں ایسا پیوند لگاتے ہیں کہ اجنبیت باقی نہیں رہتی، معاملہ فہمی اور دور اندیشی بھی آپ کے خصائص میں سے ہے، آپ کی تصانیف کے مطالعہ سے دنیائے اسلام کی وسعت، عظمت اور خوبیوں اور ترقیوں کا اندازہ ہوتا ہے، غیر اقوام پر ان کے پڑھنے سے اسلام کی حقیقی عظمت اور خوبیاں منکشف

ہو جاتی ہیں، یہ کتابیں سہل پسندی، عام فہمی اور دلآویزی میں اپنی آپ نظیر ہیں۔"

علامہ شبلی کے اثرات علامہ شبلی کی تمام ادبی و علمی خصوصیات سے مولانا سید سلیمان ندوی کے قیام ہی کے زمانہ میں متاثر ہو رہے تھے، چنانچہ علامہ شبلی نے جب دارالعلوم ندوہ کی معتمدی قبول کی تو مولانا سید سلیمان ندوی کو غیر معمولی مسرت ہوئی، اور ندوہ میں ان کی تشریف آوری کے سلسلہ میں اپنی خوشی کا اظہار ایک فارسی قصیدہ میں کیا، جس کے بعض اشعار یہاں پر صرف اس لئے نقل کئے جاتے ہیں، تاکہ اندازہ ہو کہ علامہ شبلی کے علم و فضل اور ادب و انشاء کا اثر سید صاحب موصوف پر اس وقت تک کتنا پڑ چکا تھا،

عصائے موسوی کلکش ید بیضیات قرطاسش — سطور صفحہ اش چوں جعد بر رخسار نورانی

صریر خامہ اش نغمہ سرائے گلشن حکمت — مداد ش از پئے چشم ورق کحل صفاہانی

گراں تر چند اوراقش بود از گنج قارونی — نی ارزد بہ یک حرفش ہمہ سامان سلطانی

سنان خامہ اش کشور کشائے معنی و دانش — زبانگ جبل صیتش پر فضائے کون امکانی

خجل از حسن نثر ش لعبتان حجلۂ گردوں — عرق از در نظمش بر جبین ابر نیسانی

بخواہم از خداوند کہ تا ہست حی قیوم — بماند زندہ جاوید این شبلی نعمانی

نوشتم چوں مدیح حضرۃ الاستاذ و برخواندم — ندا آمد مرا از پردۂ ناموس ربانی

دلیل فضل ممدوحت ز مدح تو ہویدا شد

بہ پیش مور سر نہ نہی کہ ہنا ہم سلیمانی

علامہ شبلی کی نظر کیمیا اثر علامہ شبلی نے جب سید صاحب موصوف کو اپنی تربیت میں لے لیا تو استاد کی نظر کیمیا اثر سے ان میں اور بھی زیادہ جلا پیدا ہونے لگی، علامہ شبلی میں مس خام کو کندن بنانے کا بھی غیر معمولی وصف تھا، ایم، اے، او، کالج کی پروفیسری کے زمانہ میں انہی کی صحبت میں

بزرگ مرزا، خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق صاحب (ناظم انجمن ترقی اردو) سید سجاد حیدر یلدرم، سید محفوظ علی، شیخ محمد عنایت اللہ (سابق ناظم دار الترجمہ) حیدرآباد، مرزا خوشی محمد، اور مسعود علی محوی وغیرہ ہیں، علم و ادب اور شعر و سخن کا چسکا پڑا، چنانچہ مولوی مسعود علی صاحب محوی بی اے جو حیدرآباد دکن کے جج ہوئے، اپنے مجموعہ نظم فارسی، "نذر عقیدت" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں،

"علی گڑھ کالج کے بی۔ اے کلاس کے فارسی نصاب میں قاآنی کے چند قصائد بھی تھے، مولانا شبلی فارسی کے پروفیسر تھے، مولانا مرحوم ان نادر الوجود استادوں میں تھے جو نہ صرف کسی مضمون کو پڑھا اور سمجھا دیتے، بلکہ اس مضمون کے ساتھ شاگردوں میں حقیقی دلچسپی پیدا کرنے میں ملکہ رکھتے ہیں، مولانا مرحوم مغفور کی دلچسپ صحبت اور شاگردی کا اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے، اور بعض نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے پاک و صاف ہو گئے، اور بعض نے فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی، اور اچھے شعر کہنے لگے، مگر میں اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک کامیاب نہ ہو سکا،"

مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی فرماتے ہیں:

"مجھکو بھی اگر کچھ لکھنا آیا تو انہی صحبتوں کے اثر سے تاریخ و ادب فارسی کا ذوق یہیں نشو و نما پذیر ہوا"[1]

استاد سے استفادہ علامہ شبلی کی علمی صحبت و تربیت سے سید صاحب موصوف بھی زیادہ سے زیادہ مستفید ہوئے، چنانچہ مئی ۱۹۰۵ء میں سید صاحب موصوف کا ایک مقالہ علم ہیئت اور عرب الندوہ میں شائع ہوا تو اس مضمون کے متعلق علامہ شبلی خود جون ۱۹۰۵ء کے الندوہ

[1] منقول از حیات شبلی، مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی ص ۱۵۰، ۱۵۱،

کے شذرات میں تحریر فرماتے ہیں کہ،

"ہم کو اس بات کی خوشی ہوئی کہ جو مضمون ہمارے دارالعلوم کے ایک طالب علم کا پچھلے پرچہ میں شائع ہوا وہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا، جناب مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے ایک خط حال میں ہم کو لکھا ہے، اس میں تحریر فرماتے ہیں:۔

سب سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ دارالعلوم نے اپنی تعلیم کا نہایت عمدہ نمونہ پہلی ہی بار پیش کیا ہے، فبارک فیھا وفی طلبتھا وفی تعلیمھا " مجھے امید نہیں بلکہ یقین ہے کہ عربی کی کافی تعلیم اور انگریزی کی بقدر ضرورت، ہماری قوم میں ایسے لائق مضمون نگار اور مصنف پیدا کرے گی، کہ محض انگریزی تعلیم آج تک ویسا ایک بھی نہیں پیدا کر سکی"۔

مولانائے موصوف نے جو کچھ لکھا ہے، اسکی واقعیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مسلمانوں میں جو لوگ علمی معرکوں کے علمبردار ہیں، وہی ہیں جو عربی تعلیم یافتہ اور انگریزی مذاق سے آشنا ہیں محض انگریزی دانی سے اب تک تو کوئی صاحب قلم نہیں پیدا کیا، آئندہ کی نسبت کون رائے دے سکتا ہے،

الندوہ کے اڈیٹر علامہ شبلی اور مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، لیکن عام دیکھ بھال کی خدمت سید صاحب موصوف ہی کے سپرد تھی، اس زمانہ میں علامہ شبلی کے پاس مصر و شام کے اکثر اخبارات و رسائل آیا کرتے تھے، جن کو سید صاحب موصوف بالالتزام پڑھتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں جدید عربی زبان میں لکھنے اور پڑھنے کی پوری مشق ہوگئی، اس ذوق نے غیر شعوری طور پر ان کی اردو انشاء پردازی کو بھی متاثر کیا،

اسناد کی تنقید

جنوری ۱۹۰۶ء کے الندوہ میں سید صاحب نے "امام بخاری" پر ایک مقالہ تحریر کیا، اور اس کی تمہید میں لکھا کہ

صحیح بخاری میں مسلمانوں میں جو عام مقبولیت حاصل ہے، اس کا اندازہ صرف اس امر سے ہو سکتا ہے کہ صحت کے لحاظ سے کتاب اللہ کے بعد اس کو جگہ دی گئی، لیکن افسوس ہے کہ بہت کم لوگ اس کے نامور جامع کے حالات سے واقف ہونگے اس لئے اس مضمون میں ہم موصوف کے حالات جمع کر کے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

اس میں اسلوب بیان اور طریقہ ادا وہی اختیار کیا گیا جو علامہ شبلی نے المامون اور سیرۃ النعمان میں اختیار کیا تھا، عبارت بھی صاف اور سلیس ہے،

الندوہ میں مضمون نگاری

۱۹۰۶ء کے جون جولائی اور اکتوبر کے الندوہ میں سید صاحب موصوف کے حسب ذیل تین مضامین اور شائع ہوئے، (۱) القرآن والفلسفۃ الجدیدہ، (۲) جامع ازہر (۳) قوت باصرہ اور نور، دوسرا مضمون تو ایک مصری فاضل کے عربی مقالہ کا ترجمہ ہے مگر یہ ترجمہ اپنی عبارت کی روانی اور سلاست کی وجہ سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا، بقیہ دو مضامین کا طرز بیان متکلمانہ ہے، اس وقت تک علم کلام سے سید صاحب موصوف کو کافی دلچسپی ہو چکی تھی، اور یہ علامہ شبلی کی صحبت کا اثر تھا، چنانچہ الندوہ (نومبر ۱۹۰۶ء) میں سید صاحب خود لکھتے ہیں کہ

"علم کلام کا شوق تمام تر علامہ شبلی کی تربیت کا نتیجہ ہے"

امام مالک سے عقیدت

اس زمانہ میں علم حدیث سے اُن کی دلچسپی غیر معمولی طریقہ پر بڑھ رہی تھی، محدثین کی شخصیتوں میں سے امام مالک نے اُن کے دل پر قبضہ کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موطا امام مالک سے اُن کو بیحد گرویدگی پیدا ہوگئی، چنانچہ جنوری ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں امام مالک پر ایک مقالہ لکھا، یہ مقالہ بڑھ کر ایک کتاب کی صورت میں منتقل ہوگیا، سید صاحب موصوف اس کتاب کے دیباچہ میں رقمطراز ہیں:۔

"مجھکو علم حدیث کی ابتدا سے طلب سے امام موصوف اور اُن کی موطا سے بدرجۂ غایت عقیدت رہی ہو، اسی کا اثر ہے جس نے مجھے اس فرض کے انجام پر آمادہ کیا، چنانچہ طالبعلمی کے زمانہ میں میں نے اس کا سلسلہ شروع کیا، اور جنوری ۱۹۰۷ء کے الندوہ میں اس پر ایک مضمون لکھا، فراغت کے بعد سب سے پہلے اسی کتاب کی تکمیل کا خیال ہوا، ابھی (امام مالک کی) تصنیفات کا حصہ ختم ہوا تھا کہ اور اجتہادات کی بحث شروع تھی، اور جو اصل میں اس کتاب کا جوہر ہو سکتا تھا، کہ حضرۃ الاستاذ (مولانا شبلی) نے وفات پائی، اور دم نزع وصیت فرمائی کہ تمام کام چھوڑ کر سب سے پہلے سیرۃ نبوی کی تکمیل کی جائے، اسی بنا پر جاں تک حیات امام مالک کی مسافت طے ہو چکی تھی، قلم کا مسافر وہیں پہنچکر رک گیا، اور اب آیندہ اس کی تکمیل کی فرصت ہاتھ آنی مشکل معلوم ہوتی ہے، اس لئے جو حصہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، اس کو وقف ناظرین کیا جاتا ہے"

حیات امام مالک

حیات امام مالک سید صاحب موصوف کی پہلی تصنیف ہے، اور جس ادھورے اور ناکمل طریقہ پر اس کو لکھ کر شائع کیا گیا تھا، اس کا اعتراف خود سید صاحب موصوف کی مذکورۂ بالا تحریر میں ہے، پھر بھی اکتوبر ۱۹۳۶ء کے نگار میں ایک نوخیز مضمون نگار نے اس کتاب پر ایک طویل مقالہ سپرد قلم کرتے ہوئے لکھا کہ

"مجھے توقع تھی کہ .... مصنف نے واقعات و حالات پوری کاوش سے جمع کئے ہوں گے، معلومات میں اضافہ ہوگا، لیکن ادب و انشا کی خامیاں، تحقیق و جستجو کا فقدان، اسقام و نقائص کی فراوانی، تصحیفات و اغلاط کی کثرت دیکھکر سخت مایوسی ہوئی"

معترض نے سید صاحب موصوف کے اسقام و نقائص اور تصحیفات و اغلاط سے جو بحث

کی ہے، وہ واقعہ کے اصلی موضوع سے خارج ہے، ورنہ اس سے بھی بحث کیجاتی، کہ معترض کے اکثر اعتراضات اپنی جگہ پر درست نہیں، معترض اس کے بھی مدعی ہیں، کہ سید صاحب موصوف کی حیات امام مالک" میں ادب و انشا کی خامیاں ہیں، مگر معترض کے تیس صفحہ کے مقالہ میں کہیں ایک جگہ بھی ادب و انشا کی خامیاں نہیں دکھائی گئی ہیں، سید صاحب موصوف کی پہلی تصنیف ہے، جو گویا اُن کی طالب علمی کے زمانہ میں لکھی گئی، اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں ادب و انشا کا وہ نمونہ موجود نہیں، جو آگے چل کر اُن کی تصانیف میں پائے جاتے ہیں، پھر اس کتاب سے اُن کی آیندہ علمی و ادبی صلاحیتوں کی پوری غمازی ہوتی ہے، اس کتاب کی خامیوں کے باوجود سنہ ۱۹۴۰ء تک اس کے کئی اڈیشن نکلے،

الندوہ کی سب اڈیٹری

سید صاحب کا دارالعلوم ندوہ میں سنہ ۱۹۰۶ء میں تعلیم کا آخری سال تھا، کہ الندوہ کے سب اڈیٹر مقرر ہوئے، ان سے پہلے یہ خدمت مولانا ابوالکلام کے سپرد تھی، اسی رسالہ نے سب سے پہلی دفعہ ہندوستان کی علمی دنیا میں مولانا ابوالکلام کے نام کو بلند کیا، اور اُن کی علمی شہرت بڑھی، تو اخباروں اور رسالوں سے اُن کی مانگ شروع ہوگئی، اور جب وہ الندوہ کی سب اڈیٹری چھوڑ کر سنہ ۱۹۰۶ء میں وکیل امرتسر میں چلے گئے، تو سید صاحب موصوف کے کاندھوں پر الندوہ کا بوجھ رکھ دیا گیا، اسی سال سید صاحب موصوف اور ان کے ندوہ کے فارغ التحصیل رفقا کی دستاربندی تھی، اس کا جلسہ رفاہ عام لکھنؤ میں ہوا، سید صاحب نے اس جلسہ میں فلسفہ جدید و قدیم پر تقریر کی، مجمع بہت بڑا تھا۔ اہل علم بھی شریک تھے کسی نے اٹھ کر سید صاحب کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ اگر یہ عربی میں تقریر کریں تو جانیں کہ مدرسہ کی تعلیم کیسی ہے، سید صاحب نے کہا کہ فی البدیہہ جو مضمون مجھکو بتایا جائے، میں اس وقت عربی زبان میں اس پر تقریر کردوں، آنریبل خواجہ غلام الثقلین بی اے، ال ال بی نے ایک موضوع دیا، اور سید صاحب نے

بغیر ذرہ سی دیر کے نہایت مسلسل فصیح، اور صحیح عربی میں تقریر شروع کی، علامہ شبلی خود اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے، اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں، کہ

"تمام جلسہ محو حیرت تھا، اور آخر لوگوں نے نعرہ ہائے آفرین کے ساتھ خود کہا کہ بس اب حد ہوگئی" (مکاتیب شبلی ص ۵۸-۱۵۷)

علامہ شبلی نے نہایت خوشی میں اٹھ کر اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا (ندیم ستمبر ۱۹۴۰ء، حیات سلیمان ص ۲۹)

الندوہ کے مضامین سید صاحب موصوف نے الندوہ کی سب ایڈیٹری کی خدمت فروری ۱۹۱۰ء تک انجام دی، اور اس زمانہ میں حسب ذیل مضامین لکھے،

شمار	مضامین	سنہ	شمار	مضامین	سنہ
۱	علم ہیئت اور مسلمان	مئی ۱۹۰۶ء	۱۱	ابن خلکان و تاریخ ابن خلکان	
۲	مولانا بحر العلوم	"			اکتوبر و نومبر ۱۹۰۸ء
۳	عربی زبان کی وسعت	(جولائی، اگست، ستمبر ۱۹۰۶ء)	۱۲	ایمان بالغیب	دسمبر ۱۹۰۸ء
۴	مسلمانوں کی بے تعصبی	ستمبر ۱۹۰۶ء	۱۳	مکررات القرآن	(جنوری ۱۹۰۹ء)
۵	عرب کے یورپین سیاح	"	۱۴	خاتونانِ اسلام کی شجاعت	"
۶	طبقات الارض	(اکتوبر ۱۹۰۶ء)	۱۵	اسلام اور تمدن	فروری ۰۹ء
۷	برنابا کی انجیل	"	۱۶	اسلامی رصد خانے	(مارچ و مئی ۰۹ء)
۸	لارڈ کالون	مارچ ۱۹۰۸ء	۱۷	سود اور صحف انبیاء	جون "
۹	حضرت عائشہؓ	اپریل "	۱۸	صحابہ کی تعداد و طبقات و روایات،	اگست "
۱۰	تمدنِ اسلامی مصنفہ جرجی زیدان	(اکتوبر ۱۹۰۸ء)			

شمار	مضامین	سنہ	شمار	مضامین	سنہ
۱۹	قیامت	ستمبر ۱۹۰۹ء	۲۱	علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق	دسمبر ۱۹۰۹ء
۲۰	تحریم شراب	اکتوبر ۰۹ء			

الندوہ کے مضامین پر تبصرہ سید صاحب کے مذکورہ بالا ابتدائی مقالات کی طویل فہرست اس لئے دی گئی ہے کہ اُن سے اندازہ ہو کہ وہ اپنے استاذ ہی کی طرح علمی حیثیت سے کثیر الاشواق، اور جامع الاذواق ہو رہے تھے، یہ مضامین ہیئت، علم اللسان، طبقات الارض، مذہب، تاریخ، سیر، سوانح اور عمرانیات پر مشتمل ہیں، اور ان میں صرف ایک جذبہ کارفرما ہے، اور وہ یہ کہ اسلام اور پیروانِ اسلام نے دنیا کے سامنے کیا کیا چیزیں پیش کیں، آگے چل کر اسی جذبہ نے اُن کو اسلامی دنیا کا ایک بہت ہی متبحر، جید اور مستند عالم بنا دیا، ان میں سے بعض مقالات اب تک شوق سے پڑھے جاتے ہیں، مثلاً مقالہ "خاتونانِ اسلام کی شجاعت" ایک علیحدہ رسالہ کی صورت میں "خواتین اسلام کی بہادری" کے نام سے شائع ہوگیا ہے، اور اُس کے متعدد اڈیشن مختلف جگہوں سے نکل چکے ہیں، "اسلامی رصد خانے" کے متعلق سید صاحب موصوف ۱۹۳۳ء میں خیام لکھتے وقت ایک جگہ خود ہی فرماتے ہیں، کہ

"میں نے الندوہ کے ماہ مارچ اور ماہ مئی ۱۹۰۹ء میں اسلامی رصد خانوں پر ایک مفصل مضمون لکھا ہے، جس سے زیادہ مکمل مضمون اس باب میں اب تک میری نظر سے نہیں گذرا، (خیام ص ۱۳۱)

یہ مقالات جس حسن سلیقہ اور طرز نگارش سے لکھے جا رہے تھے، ان سے اس زمانہ کے لوگوں کو یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا، کہ سید صاحب موصوف آیندہ نہ صرف ایک متبحر عالم ہوں گے، بلکہ ادب و انشاء میں بھی اپنے استاذ کی روایت کو قائم رکھیں گے، اسی لئے بعض

خشک مضامین بھی اُن کے خاص اسلوب بیان کی وجہ سے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، مثلاً "عربی زبان کی وسعت" کی ابتدا اس رنگین طریقہ پر کرتے ہیں،

"آغاز عالم میں جب انسان اپنی طفولیت کے منازل طے کر رہا تھا، تو دلی جذبات وخیالات کا اظہار اشاروں سے کرتا تھا۔ .... پھر مفرد الفاظ کی اعانت سے اظہار مطلب کرنے لگا، رفتہ رفتہ الفاظ میں ترکیب پیدا ہوئی، جملے بنے، ایک مصدر صیغوں کے مختلف برجوں سے طلوع ہونے لگا، عبارت بنی جس میں فصاحت و بلاغت کا طرہ لگا، لفظی و معنوی صنائع اسباب آرایش بنے، اور اس طرح بیسیوں منزلیں طے کرتی ہوئی ایک خوش آواز، شیریں متمدن زبان طیار ہوئی، آج دنیا میں تقریباً کئی ہزار زبانوں کے سرسبز درخت لگے ہیں، ہر ایک کا رنگ و بو، قد و قامت، ذائقہ دوسرے سے مختلف ہے، مگر علم اللسان (فیلالوجی) کے ماہرین نے مستحکم قرائن سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ تمام زبانیں دراصل متحد النسل ہیں، اور چند درختوں کی ڈالیاں ہیں، یہ اس وقت کا قصہ ہے کہ جب دنیا ایک مختصر سی آبادی کا نام تھا اور یہ مختصر آبادی چند خاندانوں سے عبارت تھی، یہ خاندان بڑھے، اور اس کثرت سے بڑھے، کہ وہ چھوٹی سی آبادی ان کو اپنے دامن میں پناہ نہ دے سکی، اس لیے یہ خاندان مختلف سمتوں میں پھیل گئے، گو اس سے پہلے ان سب کی زبان ایک تھی، مگر اب آب و ہوا ضروریات اخلاق کے اختلاف سے اس زبان میں تراش و خراش ہو کر ایسی ہیئت بدلی، کہ ایک ہی زبان کے مختلف حصوں میں مختلف رنگوں میں ظاہر ہوئی،

(الندوہ جولائی ۱۹۰۷ء)

"علمائے سلف میں کتب بینی کا شوق" میں ایک جگہ عربی عبارت کا ترجمہ کتنے دلنشین انداز میں کیا ہے:۔

"اے میری کتابو! تم میری جلیس و انیس ہو، تمھارے ظریفانہ کلام سے نشاط اور تمھاری ناصحانہ باتوں سے تفکر پیدا ہوتا ہے، تم پچھلوں اور پہلوں کو ایک عالم میں جمع کر دیتی ہو، تمھارے منھ میں زبان نہیں، لیکن تم زندوں اور مردوں کے افسانے سناتی ہو، تم ہمسایہ ہو لیکن ظلم نہیں کرتیں، عزیز ہو لیکن غیبت نہیں کرتیں، دوست ہو لیکن مصیبت میں ساتھ نہیں چھوڑتیں"

مولانا شبلی کی تعریف

یہ سید صاحب موصوف کے قلم کی ان جولانیوں سے علامہ شبلی اندرونی طور پر برابر مسرور ہوتے رہتے تھے، مگر لائق شاگرد پر تیکھی نگاہیں بھی پڑ رہی تھیں، چنانچہ الندوہ کے دسمبر میں ۱۹۰۸ء اور جنوری ۱۹۰۹ء میں سید صاحب کے دو مضامین "ایمان بالغیب" اور "تکرارات القرآن" شائع ہوئے، تو مولانا شبلی اپنے ایک مکتوب میں ان کو لکھتے ہیں:۔

"دونوں پرچوں میں تمھارا مضمون بہت اچھا نکلا، اب تم کو تصنیفی سلیقہ آچلا، البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے، وہ بھی جاتی رہے گی" (مکاتیب شبلی ج ۲)

اسی مکتوب میں مولانا شبلی اپنے محبوب شاگرد کو لکھتے ہیں:۔

"یہ ممکن ہے کہ تم کو مصر بھیجا جائے"

دروس الادب ولغاتِ جدیدہ کی تالیف

اس وقت سید صاحب موصوف ندوہ میں جدید عربی کے معلم تھے، مگر استاد کی آرزو پوری نہ ہو سکی، کیونکہ اس زمانہ کی مصری سیاسیات کے سبب سے حکومتِ ہند نے سید صاحب کو مصر جانے کی اجازت نہ دی، سید صاحب موصوف کو اردو زبان کی محبت کے ساتھ عربی زبان سے بھی شغف پیدا ہو چکا تھا،

اس لئے اس زمانہ میں اپنے استاذ کی تجویز کے مطابق دروس الادب کے نام سے دو ابتدائی عربی رسالے لکھے جو اب بھی بعض مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں، پھر ۱۹۱۱ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں یہ طے ہوا کہ جدید الفاظ و لغات کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے، اور یہ کام سید صاحب موصوف کے سپرد کیا گیا جس کو انھوں نے دو برس میں پورا کیا، ۱۹۱۳ء میں ندوہ کا جب اجلاس لکھنؤ میں ہوا، تو اس کے صدر علامہ سید رشید رضا مصری اڈیٹر المنار کے سامنے یہ کتاب پیش کی گئی، بعد میں لغات جدیدہ کے نام سے شائع ہوئی، اور یہ عربی مدارس میں نئی عربی زبان کی دقتوں کے حل کرنے میں اب تک بہت معاون ہے، ۱۹۱۱ء میں مولانا شبلی کے قائم کردہ شعبہ سیرۃ النبی میں اُن کے لٹریری اسسٹنٹ بھی مقرر ہوئے،

الندوہ کے اور مضامین ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک سید صاحب نے الندوہ میں جو مضامین لکھے ان میں سے بعض یہ ہیں:-

مضمون	تاریخ	مضمون	تاریخ
اشتراکیت اور اسلام	مئی ۱۹۱۱ء	مستشرقین یورپ	دسمبر ۱۱ء
دنیا کا بزرگ ترین انسان	جون ״	ایک جرمن کا اسلام پر لکچر	دسمبر ״
مستشرقین یورپ	جولائی ״	کتب خانۂ اسکندریہ	״
اندھوں کی تعلیم	״	فنائے مادہ	جنوری ۱۹۱۲ء
اسماء القرآن	اگست ״	عذاب	فروری ״
مستشرقین یورپ	״	مستشرقین یورپ	״
جزیہ	״	دار العلوم بیروت	مارچ ۱۲ء
مصر کے مدارس	״	سید رشید رضا	״
الاحتساب فی الاسلام	ستمبر ۱۱ء	طبقات ابن سعد	״
فرقۂ خفیہ	مارچ ۱۹۱۲ء		
روس کے مسلمانوں کے کچھ متفرق حالات	مئی ۱۲ء		

ان مضامین پر تبصرہ ان تمام مضامین کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے، کہ سید صاحب موصوف شدید مذہبی پابندی کے ساتھ ایک روشن خیال عالم بننا چاہتے تھے، چنانچہ انھوں نے پرانی مذہبی چیزوں کو زمانہ کے مذاق کے مطابق جدید رنگ میں پیش کیا، یہی وصف اُن کے استاد کے ساتھ بھی مخصوص ہے، سید صاحب موصوف کا مخاطب انگریزی داں طبقہ بھی تھا، اس لئے اُن کے مضامین میں زیادہ تر رنگ وہی ہے، جو عموماً انگریزی زبان کے اہل قلم اختیار کرتے ہیں، مضامین کی تمہید اور خاتمہ میں یہ رنگ زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے، بعض اوقات تو جملوں کی ساخت اور ترکیبوں کی بندش بھی خالص انگریزی داں انشا پردازوں کے انداز کی ہوتی ہے، اسی لئے انگریزی داں حلقہ میں بھی ان کے مضامین شوق سے پڑھے گئے،

الندوہ کا خاتمہ مئی ۱۹۱۲ء میں سید صاحب موصوف الندوہ کی اڈیٹری سے علیحدہ ہوگئے، اُن کے جانے کے بعد اس الندوہ کا خاتمہ ہوگیا، جس کے اڈیٹر مولانا شبلی نعمانی اور مولینا حبیب الرحمن خاں شروانی تھے، ندوہ کے بعض فرزندوں نے اس رسالہ کو جاری رکھنے کی کوشش کی، اور اگست ۱۹۱۶ء تک چلتا رہا، مگر اس میں وہ روح نہیں تھی جو مولانا شبلی کی اڈیٹری اور سید صاحب موصوف کی سب اڈیٹری کے زمانہ میں تھی، بالآخر ۱۹۱۶ء میں وہ بالکل بند ہوگیا، ۱۹۴۰ء میں ندوہ کے بعض پرجوش طلبہ نے اس بھولی ہوئی یاد کو پھر تازہ کرنے کی کوشش کی، اس میں بعض اچھے مضامین شائع ہوئے، خصوصاً "میری محسن کتابیں" کے عنوان سے ہندوستان کے تمام مشاہیر نے بہت ہی مفید اور دلچسپ مضامین لکھے، لیکن اس کا معیار زیادہ بلند نہ ہوسکا، پھر ناسازگار حالات کی بنا پر اس کو بہت ہی

جلد بند کر دینا پڑا،

الندوہ کے کارنامے اس رسالے نے صرف دار العلوم ندوہ کے مقاصد کی حسب خواہ تبلیغ کی، اور ہندوستان میں عربی تعلیم کی اہمیت مسلمانوں کے ذہن نشین کرائی، بلکہ علمی حیثیت سے اس کے کارنامے بہت ہی قابلِ قدر اور اہم ہیں، اس میں علوم اسلامیہ کی تجدید، عقل و نقل کی تطبیق، معقول و منقول اور قدیم و جدید علوم کے موازنہ اور عربی نصاب کی تعلیم پر بہت سے محققانہ مضامین شائع ہوئے ہیں، ان مضامین سے علماء میں ایک حرکت پیدا ہوئی، اور اُن کو احساس ہوا کہ ان کا علمی دائرہ صرف منطق و فلسفہ کی درسی کتابوں کی شرحیں، حاشیے، اور تعلیقات لکھنے، یا مناظرانہ رسائل تالیف کرنے ہی تک محدود نہیں، بلکہ اسلام اور علوم اسلامیہ کے جدید مباحث کا ایک وسیع میدان ہے، پھر یہ تمام مضامین جس نئے طرزِ نگارش اور نئے پیرایہ بیان میں لکھے گئے، وہ نوجوانوں خصوصاً نوجوان علماء کے لئے مشعلِ ہدایت کا کام دینے لگے، چنانچہ الندوہ نے ملک میں جو علمی نتائج پیدا کئے، وہ حسب ذیل بتائے گئے ہیں،

۱- اردو زبان میں علمی مباحث کا ایک بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا،

۲- جدید تعلیم یافتوں کو اسلام کے مذہبی اور علمی کارناموں سے آشنا کیا،

۳- علماء کو جدید مسائل سے روشناس کیا،

۴- عربی خواں طلبہ میں اپنے پرانے ذخیروں سے کام لینے کا سلیقہ پیدا کیا،

۵- اسلام اور تاریخ اسلام پر سے بہت سے اعتراضوں کو دفع کیا،

الندوہ کے ان تمام علمی نتائج میں علامہ شبلی اور مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے ساتھ سید صاحب موصوف برابر کے شریک کئے جا سکتے ہیں کیونکہ الندوہ کے مضامین کا شمار کیا جائے تو تعداد کے لحاظ سے سب سے زیادہ مضامین انہی کے نکلیں گے بعض پرچے تو شروع سے آخر تک انہی کی تحریروں کے رہین منت ہیں

(باقی)

ملا ناظم ہروی

از۔ ڈاکٹر غلام مجتبیٰ انصاری، ڈی۔ لٹ، استاد فارسی ٹی ان بی کالج بھاگلپور

ایران کا صفوی خاندان اپنی علمی و ادبی سرپرستی کے لیے مشہور رہا ہے، اس خانوادہ کے تین حکمران شاہ عباس اعظم، شاہ صفی، اور عباس ثانی اور اسمٰعیل شاہ طہماسپ بڑے ہی صاحبِ علم، سخن سنج اور سخن شناس گزرے ہیں، اس دور کے شعراء کی تعداد کافی ہے، انہی میں صائب، وحشی، کلیم، عرفی، ہاتف، فصیحی، والہ ہروی اور مرزا جلال اسیر جیسے جلیل القدر شعراء تھے، ان میں سے کچھ شعراء ہندوستان آئے، اور یہیں زندگی بسر کی اور ان سے سبک ہندی منسوب ہوا سبک ہندی کے متعلق یہ کہا جاتا ہے، کہ اس میں زیادہ تر مشکل آفرینی اور پیچ در پیچ عبارتیں ہیں، لیکن یہ اعتراض بڑی حد تک صحیح نہیں، اس سبک میں مضامین کی دلکشی کے ساتھ نکتہ رسی، باریک بینی اور دقت نظری کی اچھی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

ناظم ہروی کا تعلق اسی دور سے یعنی گیارھویں صدی کے دورِ اول سے اس کے تقریباً اواخر (ھ [illegible] تک) ہے، یہ زمانہ صفوی حکومت کا عہدِ زرین کہلائے جانے کا مستحق ہے، ناظم ہروی کا تعلق تو صفوی دربار سے نہیں رہا، لیکن وہ عباس قلی خان شاملو کے دربار سے

منسلک تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کا بیگلر بیگ تھا، سرو آزاد میں ہے، وہ حسن خان شاملو کا بیٹا تھا، جو خراسان کا گورنر رہا۔ فارسی شاعری کا دلدادہ اور خود بھی ایک اچھا شاعر تھا، طاہر نصر آبادی نے اپنے نسخہ میں لکھا ہے کہ اس نے تین ہزار اشعار کا دیوان چھوڑا ہے، مرزا فصیحی جیسا شاعر بھی شروع میں اسی کے دربار سے وابستہ رہا، اور اس کا مصاحب خاص رہا، لیکن بعد میں شاہ عباس اعظم کے دربار کا شاعر منتخب ہوا، اور اس سے کئی بار بیش بہا انعامات حاصل کیے، ناظم ہروی کو بھی حسن خان شاملو کی سرپرستی حاصل رہی، ناظم کے دیوان کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس نے حسن خان شاملو کی شان میں قصیدے لکھے، بہت سی غزلیں اور قطعے بھی اسکی تعریف میں کہے، مجمع النفائس، مخزن الغرائب، خلاصۃ الکلام اور نشتر عشق میں ہے کہ وہ مرزا فصیحی کا شاگرد تھا، جو شاملو خان کے دربار سے وابستہ رہا، اس لیے بظاہر معلوم ہوتا ہے، کہ اپنے استاذ ہی کی وساطت سے حسن خان شاملو کے دربار میں رسائی ہوگی ہوگی یا جب وہ بیٹے کے دربار سے منسلک تھا، تو باپ کے دربار میں پہونچنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ مجمع الفصحاء میں ہے کہ وہ حسن خان شاملو کا مداح رہا ہے۔

مداح حسن خان شاملو حاکم خراسان بود از جانب گُجے از شاہان صفوی اکثر مقاطع غزلہا بلکہ اکثر غزلیات در تعاریف خان مسطور است"[1]

سرو آزاد میں ہے۔

درخدمت عباس قلی خان ولد حسن خان شاملو اعتبار عظیم داشت بہت بفیض رسائی مرحوم می گماشت۔ (ص ۱۰۵)

---

[1] مجمع الفصحا، ص ۲۸ ۲ دیوان ناظم ہروی قلمی غزل ۵۶ ۴

لیکن وہ باضابطہ طور پر عباس قلی خان شاملو کے دربار کا شاعر تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کا بیگلر بیگ تھا۔

نام اور ولدیت بیشتر تذکرہ نگاروں نے ناظم ہروی کا ذکر ملا ناظم ہروی کے نام سے کیا ہے، طاہر نصر آبادی جو ناظم کا ہمعصر ہے اپنے تذکرہ میں اسے ملا ناظم ہراتی کے نام سے یاد کرتا ہے،[1] مخزن الغرائب کے مولف احمد علی ہاشمی نے "ملا فرح حسین" کے نام سے اسکا ذکر کیا ہے، لیکن اس نام کی تصدیق کسی دوسرے تذکرہ سے نہیں ہوتی، اصل یہ ہے کہ اس کا نام علی رضا تھا، اور یہ خود ناظم کے ان اشعار سے ظاہر ہے[2]

در آغاز فطرت در آوان مبدا — علی بود نامم رضا بود کارم
چو گشتم ملقب بہ ناظم یقین شد — کہ وہ ذرہ در ملک نظم اختیارم

علی رضا ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے والد کا نام شاہ رضا سبزواری تھا، برٹش میوزیم کیٹلاگ[3] اور خدا بخش لائبریری کے انگریزی کیٹلاگ[4] دونوں میں درج ہے، کہ وہ شاہ رضا سبزواری کا بیٹا تھا، اس لیے باپ کے نام کی مناسبت سے علی رضا نام ہونا عین قرین قیاس ہے، البتہ ناظم تخلص کی شہرت و مقبولیت نے فطری طور پر اصل نام کو گوشۂ گمنامی میں ڈالدیا۔

تاریخ و جائے پیدائش ناظم کی تاریخ پیدائش کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا خود شاعر نے اپنے دیوان میں اسکی طرف اشارہ نہیں کیا، لیکن برٹش میوزیم کے کیٹلاگ جلد سوم میں قصص الخاقانی کے مولف کا قول ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ ۱۰۷۰ھ میں ناظم کی عمر ۷۰ سے زائد تھی،[5] اس قول کے

---

[1] تذکرہ طاہر نصر آبادی ص ۳۳۰ [2] دیوان ناظم قلمی قصیدہ ۳ [3] برٹش میوزیم کیٹلاگ ج ۲ ص ۶۹۲ [4] انگریزی کیٹلاگ خدا بخش لائبریری، [5] برٹش میوزیم کیٹلاگ ج ۲ ص ۶۹۲

مطابق اگر اس کی عمر ۶۰ سال سے اوپر یعنی ۶۰ اور ۶۵ سال کے درمیان تسلیم کر لی جائے تو اس حساب سے اس کا سنہ پیدائش ۱۰۱۱ھ سے ۱۰۱۶ھ کے درمیان ہو سکتا ہے، جائے پیدائش خراسان کا علاقہ ہرات ہے، جو ان دنوں حکومت افغانستان کے ماتحت ہے، ناظم نے اپنے دیوان میں جابجا اشارہ بھی کیا ہے کہ اس کا مولد و وطن خراسان ہے، اپنے ایک شعر میں خراسان سے اپنی نسبت کا یوں اظہار کرتا ہے،

طالب از آمل و ناظم ز خراسان برخاست بود دیوان فصاحت بدو مصرعہ محتاج

طاہر نصرآبادی نے لکھا ہے کہ وہ ہراتی ہے اور ہرات میں یکتا ہے،

ہراتیت و در آں ولایت وحید است [2]

اپنی مثنوی "یوسف و زلیخا" میں وہ حسن خان شاملو سے ہرات و خراسان کی نگہداری کی استدعا ذیل کے اشعار میں کرتا ہے۔

بدوراں چنیں فرخندہ شاہی کہ عشرت داشت ہر سو ہر نگاہی [3]

ہرات کامرانی را نگہدار خراسان بزرگی را نگہدار

شاعرانہ تعلی میں خراسان کو اپنے وجود کی بنا پر "گنجینۂ انفاس مسیحا" کہتا ہے،

وطن از من شدہ گنجینۂ انفاس مسیحا [4]

ابتدائی تعلیم اور استاد

ناظم کی ابتدائی تعلیم کی بابت بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں، قرینہ یہی ہے کہ ہرات ہی میں اس نے ابتدائی تعلیم حاصل کی ہوگی، مجمع النفائس [5]، مخزن الغرائب [6]، خلاصۃ الکلام اور نشتر عشق کے مولفین نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ فن شاعری میں اس کا استاد ہرات کا مشہور شاعر اور خراسان کے گورنر کا درباری شاعر مرزا فصیحی ہروی تھا،

[1] دیوان ناظم قلمی [2] تذکرہ طاہر نصرآبادی [3] مثنوی یوسف و زلیخا (نولکشور پریس لکھنؤ) [4] دیوان ناظم قلمی قصیدہ [5] مجمع النفائس قلمی ص ۴۰۰ [6] مخزن الغرائب قلمی ص ۹۲۵

ناظم کو اپنے استاد سے بڑی محبت و عقیدت تھی، ایک شعر میں وہ فصیحی سے جدا ہونے پر اپنے خیال کا اظہار اس طرح کرتا ہے،

جام دیدار فصیحی داشت ناظم تشنہ ای کز دلم ہجران چندیں سالہ را آوارہ کرد [1]

یہ فصیحی ہروی وہی ہے، جس کے تین مشہور شاگرد والہ ہروی، جلال اسیر، ناظم ہروی ہوئے، عجب اتفاق کہ یہ تینوں ایران سے ہندوستان آئے، خود فصیحی کو ہندوستان آنے کی آرزو تھی، مگر یہ آرزو تشنہ رہی، البتہ اس نے اپنا دیوان نقل کر کے آگرہ بھیج دیا۔ [2]

ناظم اور عباس قلی خان شاملو اور ناظم

ناظم اور اس کی ادبی خدمات کا حقیقی قدرداں عباس قلی خان شاملو تھا، جو شاہان صفویہ کی جانب سے ہرات کے مستقل بیگلر بیگ تھا، ناظم نے اگرچہ حسن خان شاملو گورنر خراسان کی تعریف میں بھی اشعار کہے ہیں، لیکن ان کی نوعیت اور حیثیت اضافی ہی ہے، اصلاً وہ عباس شاملو کا شاعر تھا، اسپرنگر اپنے کیٹلاگ میں لکھتا ہے کہ ناظم عباس قلی خاں شاملو کا درباری اور خراسان کا بہترین شاعر تھا [3]، برٹش میوزیم کیٹلاگ سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ناظم کی ساری زندگی خان مذکور کے دربار میں گذری [4]، خدابخش لائبریری کے کیٹلاگ کے مطابق ناظم عباس قلی خان کا درباری شاعر اور عزیز ترین مصاحب تھا، اپنے ممدوح کی فرمائش پر مثنوی "یوسف و زلیخا" لکھی [5]۔ طاہر نصرآبادی اور والہ داغستانی نے ان دونوں کے تعلقات پر خاصی روشنی ڈالی ہے، تذکرہ نصرآبادی میں ہے،

[1] دیوان ناظم قلمی، [2] مجمع النفائس قلمی ص ۵۰۳، [3] اسپرنگر کیٹلاگ ص ۹۰، [4] برٹش میوزیم کیٹلاگ ص ۹۲ [5] کیٹلاگ نمبر ۳۳۶ ص ۱۳۹

"درخدمت عالی جاہ عباس قلی خان اعتبار عظیم داشت، چنانچہ

در یوسف و زلیخا مدح مشارالیہ در نہایت قدرت کردہ"

والہ داغستانی رقمطراز ہے،

"درخدمت عباس قلی خان شاملو کہ در زمان شاہ سلیمان مغفور بیگلر بیگی باستقلال

ہرات بود، بسر بردہ خان مزبور مراعات نسبت بوے می فرمود مثنوی یوسف

و زلیخا، بفرمودۂ این خان والاشان گفتہ و داد سخنوری دراں دادہ در مدت

چہاردہ سال باتمام رسانیدہ است"[1]

مثنوی یوسف و زلیخا | ناظم ہروی کی یہ مثنوی فارسی ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہے، یہ

اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ ۱۴ سال کی مدت میں اس مثنوی کی تکمیل ہوئی، مولف خلاصۃ الکلام

نے لکھا ہے کہ چودہ سال میں پایہ تکمیل کو پہونچایا،

"و در مدت چہاردہ سال باہتمام رسانیدہ"[2]

نشتر عشق نے مدت تحریر کے ساتھ سنہ اختتام بھی ذکر کیا ہے۔

"... در عرصہ چہاردہ سال سنہ یک ہزار و ہفتاد و دو باتمام رسانیدہ"[3]

ید بیضا کے مولف کا بھی یہی خیال ہے۔

"و اتمام آن کتاب در سنہ اثنین و سبعین والف اتفاق افتادہ،"[4]

خود ناظم کے قول کے مطابق اس مثنوی کی تاریخ آغاز و انجام اس طرح ہے،

ز ہجرت در ہزار و پنجہ و ہشت ... ز مولودش سخن خوش دو دمان شد

بگذارش زان درین فرصت فروغست ... کہ سال چاردہ سن بلوغست

---

[1] ریاض الشعراء ص ۴۰۷ [2] خلاصۃ الکلام قلمی [3] نشتر عشق قلمی ص ۱۸۱۸ [4] ید بیضا قلمی ص ۲۳۲

مثنوی میں ایک باب عباس علی خان شاملو کی مدح میں ہے، جس میں ناظم اپنی

محبت، غایت تعلق کے اظہار کے بعد بڑے دلچسپ انداز میں مثنوی کی وجہ تالیف بیان کرتا ہے

بہجت شاملو عباس خانست ... کہ چوں دولت مقدس دودمانست

نمی ترسم بگویم ہرچہ باشد ... کم از شاہست و بیش از ہرچہ باشد

آگے کہتا ہے کہ بادشاہ نے مجھے بادۂ سخن سے سرشار پایا تو نگاہیں اٹھائیں اور کہا اے

میرے مداح تیرے اشعار نہایت درخشندہ ہیں، غزل میں تیرا جواب نہیں، تیرے قصائد بزم

احباب کے لیے شمع وفا اور تو اقلیم سخن کا بادشاہ ہے، پھر کیا وجہ کہ مثنوی میں تیرا طائر فکر آمادۂ

پرواز نہیں۔

چرا در مثنوی فکرت رسا نیست ... نمی دانم چرا نا شد چرا نیست؟

تو سلطنت کی طرح شب و روز میرے ہمراہ ہے، صرف سلطنت کا ہمدم ہی نہیں

بہی خواہ بھی ہے، پھر (اس صنف میں) تیرا بے ترنم رہنا زیب نہیں دیتا تو ایسا نہ کر کہ

تیرا پھول غنچہ ہی رہے، نشہ شراب خمخانہ میں قید رہے،

چو دولت روز و شب ہمراہ باشی ... نہ دولت دوست دولت خواہ باشی

نخواہیمش کہ باشی بے ترنم ... گلت در غنچہ باشد بادہ در خم

جب سارے اسباب مہیا ہیں، ستم ہے کہ ایسے میں تیرا ہنر جوہر نہ دکھائے میں

دشواری کی صورت میں تیرے لیے خزانے کے در وا کر دوں گا، یہ باتیں سن کر ناظم

پھول کی طرح کھل اٹھا، نشہ شراب کی طرح جوش میں آیا اور کہا۔

بحالت صید عنقا می تواں کرد ... تو ای چوں کار فرماں می تواں کرد

لیکن ساتھ ہی یہ عذر بھی پیش کیا کہ یہ قصہ تو پہلے ہی نظم ہو چکا ہے، قصہ پارینہ کی

باز خوانی سے کیا حاصل ؟ اس پر شاملو نے کہا دنیا کے تمام راستے پیش پا و پامال ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ان راہوں پر چلنا ہی چھوڑ دیا جائے ، یہ سننے کے بعد ناظم تیار ہو گیا

کمر بستم بتحصیل رضایش		زباں دادم بترتیب دعایش

الٰہی تا ز یوسف و زلیخا		کنند آرایش معنی دانش

بمصر بخت فرمانش رواں باد		کہ فرمانم باین نظم رواں داد

ہندوستان میں ناظم کی آمد

بیشتر تذکرہ نگار حضرات اس کی ہندوستان کی آمد کے بارے میں خاموش ہیں ، لیکن مخزن الغرائب کے مولف نے بہ صراحت عہد شاہجہانی میں اس کی آمد کا ذکر کیا ہے ، شاہجہان کے آخری دور میں وہ ہندوستان آیا ، اور شاہزادہ شجاع سے وابستہ ہو گیا ، لیکن شجاع کی ہزیمت و زوال کے بعد وہ جہانگیر نگر معروف ڈھاکہ میں درس و تدریس میں مشغول ہو گیا ۔

"در آخر عہد شاہ جہان بہند آمدہ بملازمت شاہزادہ شجاع بسر می برد بعد مفقود شدن شاہزادہ مذکور در جہانگیر نگر عرف ڈھاکہ کہ از ولایت بنگالہ است رحل اقامت انداخت و بتدریس مشغول گشتہ بود"[1]

ناظم کے دیوان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان آنے کی خواہش اسے عرصہ سے تھی وہ ہرات کے لوگوں اور ان کی ناقدری سے دل برداشتہ ہو چکا تھا ، شیراز کے راستہ سے وہ ہندوستان روانہ ہوا ۔

چنان مشتاق بال افشانی ہندم کہ در ایران		اگر از زلف خوباں دام بگشانید آزادم

صدفہا چشم بر راہ ہند ہر سو نیستم محزوں		اگر چون قطرۂ نیساں ز چشم ابر افتادم

چناں دلگیرم از بیقدری آہ وطن ناظم		کہ ہنگام وداع غم فزای دشمنان شادم

ناظم کا زمانہ پیری

عمر کے آخری حصہ کے بارے میں بھی تذکرہ نگار خاموش ہیں ، البتہ اسکے دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ عزلت و خمول کی نذر ہوا ، وہ خود گمنام رہنا زیادہ پسند کرتا تھا ، شہرت و نام و نمود سے وحشت سی ہو گئی تھی ، عنقا کی طرح معدوم ہونے کی تمنا تھی ۔

ناظم از بس مست ذوق گوشہ گیری گشتہ ام		ہر دم از خود تا بخلوتگاہ عنقامی روم[1]

زمانہ پیری اپنے ساتھ ضعف ، لاغری اور اعصاب شکستگی ساتھ لایا تھا ، اس کا خیال تھا کہ جس طرح بوسیدہ کپڑا رفو قبول نہیں کرتا ، اسی طرح بوسیدہ و کہنہ بدن بھی دوا اور علاج کے لائق نہیں رہتا ۔

مخمورم و سوی بادہ نتوانم رفت		مشتاقم و راہ ارادہ نتوانم رفت

پیری و ضعیفی چناں گرد و سوار		کز خاطر کس پیادہ نتوانم رفت[2]

تکرار دوا کم نکند ضعف بدن را		بسیار مزن بخیہ قبا کہنہ تن را[3]

عمر کے اس دور میں نہ خواہشیں رہ گئی تھیں ، نہ ہی تلخ و شیریں کا احساس ، اب سلیمانی کی سرو سامانی نہیں چیونٹی کی قناعت مد نظر تھی ۔

بری از ما بر د رنگ خواہش دل و ہوس		تلخی از مار فتہ چوں گل در شکر افتادہ ایم[4]

ہمچین از ضعیفی بساط غرور		اگر مور گردی سلیمان مباش[5]

اسی ضعف و گمنامی کے عالم میں ناظم ۱۰۸۱ھ میں اس عالم سے چل بسا ، مخزن الغرائب کے مطابق عاشورہ کے روز فجر کی نماز میں سجدہ کی حالت میں اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی ۔

مرزا محمد طاہر نصر آبادی کو ناظم ہروی کے حسب ذیل اشعار زیادہ پسند آئے ہیں ،

---

[1] دیوان ناظم قلمی [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً [5] ایضاً ،

اسی لیے انھوں نے اپنے تذکرہ میں انھیں نقل کیا ہے۔[۱]

دلم از لعل تو جز حرف جفا نشنیداست از گل عمر کسی بوی وفا نشنیداست

ناظم من ہر کہ بر حرف تو آید بزبان زانکہ معنی کسی از لفظ جدا نشنیداست

نامی از خویش در جہان بگذار زندگانی برای مردن نیست

منکر کے از مرید شدن پیر میشود چوبی کہ از گرہ بجہد تیر میشود

باشد کمال مردم بمغز درز دال نی راچو سوختند طباشیر میشود

بلبل آنروز کہ شد بیضہ شکن دانستم کہ مکافات ز آہن قفسی می سازد

گر مرا امروز ساماں داد گردوں منت اوست بسکہ محتاجم بیک عمر نیاز قانع میشوم

از غلط بخشی ابنای زمان نیست عجب (میآید) گز گہر آب ستانند و دیر ریا بخشند

گر خدا را از برای رزق طاعت میکنی خانہ میسازی و بر بامش زراعت میکنی

آسماں گردد نگردد گر توانی راست شد شاہد این گفتگو انگشت در انگشتری است

از لطافت بسکہ روحانی سرشت افتادہ است گیرمش گر در بغل پندارم آغوشم تہی است

دست از کرم بعذر تنگ مایگی مشوی برگی در آب کشتی صد مور میشود

گردن رغبت مکش بر افسر زرین کلاہ این گل آتش کہ بر سر زد کہ سرتا پا نسوخت

اور تذکرہ نویسوں نے بھی اس کے کلام کی داد دی ہے، محمد افضل سرخوش نے لکھا ہے،

"استاد خوش خیال و صاحب زبان بودہ، مثنوی یوسف و زلیخا بادا ہائے

---

[۱] تذکرہ طاہر نصرآبادی۔ ص ۳۳۰، ۳۳۱

رنگین در روزمرہ دل نشین بستہ"[۱]

مرزا سرخوش نے اس کے حسب ذیل اشعار پسند کیے ہیں۔[۲]

آن بلبلم کہ ہر گاہ از دل کشم فغاں را از خون چو ساغرمے پر سازم آشیاں را

کانیست خرقہ ز لباس جہاں مرا آنہم برائے سر بگریباں کشیدن است

گر لب زخم شہیداں خشک ماند دور نیست جوہر تیغ تو در زنجیر دارد آب را

در خانقاہ وحدت ذکر مخالفت نیست چوں تار سبحہ یک حرف از صد دہن برآید

ہتم آزادگاں را ہم عناں افتادہ ام سایہ سرو م بپائی راستاں افتادہ ام

میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اس کی تعریف اس طرح کی ہے۔[۳]

"عمدہ ناظمان جواہر معانی، و زیدہ گہر بندان عرائس سخندانی است

. . . . برہان استعدادش مثنوی "یوسف و زلیخا" ست کہ یوسف

سخن را از چاہ و زندان وارہاند و بمصر بلند پایگی بردہ بر تخت نشاند

اتمام این کتاب در سنہ اثنین و سبعین والف (۱۰۷۲) شدہ است سنبل

شورش کاکلے می فشاند۔

اس کے کلام میں سے آزاد بلگرامی نے حسب ذیل اشعار پسند کیے ہیں۔[۴]

خواہم کہ رخش بہ عمل زہد پے کنم تسبیح تازیانہ گلگون می کنم

ز سیر باغ و زنداں بر نیاید کام سودایم نہ شاخ سنبلے بر سر نہ زنجیری است در پایم

کنی تا چند خواب ای مست غفلت نالۂ سر کن سر مینای دل بکشا دماغ دیدۂ تر کن

پیالۂ مے از این شیوہ آبرو دارد بدست گیری افتادگان زبان مشیں

قطرۂ آبی کف خونی شد و بر خاک ریخت آدم خاکی چہ طرف از عالم ایجاد بست

---

[۱] کلمات الشعرا، ص ۱۸۱، [۲] ایضاً [۳] سرو آزاد ص ۱۰۵ [۴] ایضاً

بیقراری عضو عضوم را بکام دل رساند زخم تیغت بر تنم چون ماہِ نو سیارہ شد

بسکہ از بے اعتباریہائے خود شرمندہ ام آنچناں سوی تو می آیم کہ گویا می روم

مخزن الغرائب میں احمد علی سندیلوی نے اسکے بارہ میں "فاضل کامل بود" لکھ کر خراج تحسین پیش کیا ہے، اور اس کے کلام کا ایک طویل انتخاب پیش کیا ہے جس کے اشعار حسب ذیل ہیں۔

بیا ساقی و رنگین کن بساط محفل ما را بیک پیمانہ خون ساغر بدست آور دل ما را

زردی درد میگزند محرومان دمی رسم کز آب تیغ شوید زخم دستِ قاتل ما را

ہیچکس را بر تو حکمی نیست ناظم را مسوز وعدہ باد کردن وجای دگر بودن چرا

اینقدر ای لیلی دنیا چہ بینازی بخویش وای کز دیوانۂ میبود صحرای ترا

دل آئینۂ حسن ترکان نست بہ جا کہا عکس پیکان نست

خم شوق نخانۂ بیخودے کمر بستۂ شوق فرمان نست

شفاعت چہ حسن طاعت کدام امید خلائق ز احسان نست

نداری لباس تصور دلے دو عالم سری در گریبان نست

کا نیست خرقۂ ز لباس جہاں مرا آنہم برائے سر بگریبان کشیدن ست

بیکار نمی تواں نشستن دل چاک زخم چو پیرہن نیست

کر دست عرق ز شرم رویت بر چہرہ بوستاں سمن نیست

حق بطرف تست کر جوابے بہارے بوئے گل چاک بگریباں ز سیاست

ای اجل چندین کمن تعجیل ما ہم عاقبت مشت خاکی در گریبان کفن خواہم کرد

بشمعی نامہ از درد دل خود کردم انشا کہ مکتوب عزیزاں را بہ پروانہ میداند

ہر کسی را گشندہ باشد شعر نا فہم قاتل شعراست

جمہوریہ جزائرِ فلپائن

از

محمد نعیم صدیقی ندوی ایم اے (علیگ)

(۲)

فلپائنی مسلمانوں کا مسئلہ

فلپائن میں اسلام کے داخلہ کا قدیم ترین ثبوت ۱۳۰۰ء میں ملتا ہے، جب ایک مشہور عرب عالم اور قاضی جن کا نام مقدم بتایا جاتا ہے، دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں پہلی باران جزائر میں پہونچے، اور ملکا کے والی سلطان محمد شاہ کو مشرف باسلام کیا، مقدم کی تبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں فلپائن کے متعدد جزیرے آفتاب اسلام کی شعاعوں سے منور ہوگئے، پھر اس کے بعد وہاں تجارت و تبلیغ کی راہ سے مسلمانوں کی آمد اور دائرہ اسلام کی وسعت کا سلسلہ برابر جاری رہا، یہاں تک کہ سولو، بسائین ماجیدا ناؤ، پالوان اور منڈاناؤ وغیرہ تمام جزائر مسلمانوں کی صدائے تکبیر سے گونج اٹھے، اور رفتہ رفتہ فلپائن کے ایک وسیع و عریض علاقے پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا،

سولھویں صدی کے ربع اول میں جب اسپین نے فلپائن میں اپنے اقتدار کی بساط بچھائی تو وہاں ماجیدا ناؤ، اور سولو دو بڑی بڑی اسلامی ریاستیں موجود تھیں، جو اسپینی تسلط سے محفوظ رہیں، ان کے علاوہ منڈاناؤ، بائے، پالاوان، وغیرہ کے علاقوں میں بھی چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستیں تھیں، لیکن چونکہ یہاں کے مسلمان امریکہ اور اسپین کے خلاف مسلسل برسرپیکار رہے،

اس لئے اُن کی تعداد اور علاقے برابر سمٹتے گئے، اور اب صرف جنوبی فلپائن میں جزائر تاوی تاوی، سولو، باسیلان، ماجندانا ؤ، اور لاناؤڈل سور میں مسلمان غیر معمولی اکثریت میں ہیں، ان جزائر میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد ۵۵ لاکھ بیان کی جاتی ہے، ظاہر ہے کہ دوسرے باشندوں کے مقابلے میں یہ آبادی دس فیصد سے زیادہ نہیں ہے لیکن باایں ہمہ بھی اقتدار ان سے ہمہ وقت خوف محسوس کرتا رہتا ہے، اسی باعث جنوبی فلپائن میں مسلمان متعصب عیسائیوں کے شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنے ہوئے ہیں،

یوں تو فلپائن میں مسلمانوں پر ظلم کا سلسلہ پہلے ہی سے جاری تھا لیکن ستمبر ۷۲ء میں جب سے صدر مارکوس نے مارشل لا نافذ کیا ہے، صورت حال بے حد سنگین ہوگئی ہے، پورے جنوبی فلپائن میں خوف و دہشت کی فضا طاری ہے، چاروں جنوبی جزیروں میں سے پالاوان کو صدر مارکوس نے جبراً مسلمانوں سے خالی کرا کے غیر مسلم خطہ بنا دیا ہے، عیسائیوں کو ترغیبی لالچ دے کر شمالی حصے سے جنوب میں سولو، کوتاباتو، تاوی تاوی، اور زمبوانگا، وغیرہ کی بارہ ہزار چھ سو مربع کیلومیٹر کی زرخیز اور معدنی ذخائر سے مالامال زمین میں منتقل کیا جا رہا ہے،

مارچ اپریل ۷۶ء میں حکومت نے جزیرہ لاناؤ ڈیل سور کے متعدد شہروں میں فوجی یلغار کر دی، جس کے نتیجہ میں بکثرت غریب کسان اور مچھیرے قتل و زخمی ہوئے، اس حملہ میں لاکھوں پیسو کے مالی نقصان کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں مسجدیں، مکانات، اسکول، اور دکانیں وغیرہ تباہ کر دی گئیں، اور اس طرح حکومت کے لئے جنوبی خطہ میں عیسائیت کے فروغ کی مزید راہ ہموار ہوگئی،

اس منظم ظلم و بربریت کا مقابلہ کرنے کے لئے جنوبی فلپائن کے مسلمانوں نے "مورو قومی آزادی محاذ" (MNLF) کے نام سے ایک تنظیم قائم کی جس کا بنیادی مقصد حکومت کے

وحشیانہ مظالم کا مقابلہ اور جنوبی فلپائن میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے، ایک خود مختار حکومت "بانگسا مورو" (Bangsa Moro) کے قیام کا مطالبہ ہے، چنانچہ اس محاذ اور حکومت فلپائن کے درمیان کئی برس سے شدید ترین جنگ ہوتی رہی جس میں ۱۵ ہزار عام شہری مسلمان اور تین ہزار بانگسا مورو فوج کے جوانوں نے جام شہادت نوش کیا، ان معرکوں میں فلپائنی فوجوں کے ہاتھ سے بے حد مظالم ہوئے، بکثرت عبادتگاہیں، کھیتیاں، قبرستان، مویشی برباد ہوئے، اور گاؤں کے گاؤں تہس نہس ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں بھی فلپائن میں اتنی تباہی نہیں ہوئی تھی، ۱۸ مارچ ۷۵ء کو ایک مقام کوری ہیدور میں عیسائیوں نے ۶۸ مسلم نوجوانوں کو فنا کے گھاٹ اتار دیا، مسلمانوں کے دو لاکھ مکانات اور ۳۰۵ مسجدیں مسمار کر دی گئیں، اس خوفناک خانہ جنگی میں بیس لاکھ مسلمانوں کو بے گھر اور ایک لاکھ کو جلاوطنی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیا گیا،

معاہدہ طرابلس

مورو قومی آزادی محاذ کی بغاوت اور فلپائنی افواج کی بربریت کو روکنے کے لئے بنغازی، جدہ، کوالالمپور، استنبول اور طرابلس میں متعدد اسلامی کانفرنسیں منعقد ہوئیں، جن میں حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ سے مذاکرات کرکے جنوبی فلپائن کے مسلمانوں کے مسائل کا پرامن و پائیدار سیاسی حل تلاش کرنے کی کوشش کی گئی، جدہ کانفرنس میں مورو قومی آزادی محاذ نے مصالحت کا حسب ذیل چار نکاتی فارمولا پیش کیا تھا

۱- حکومت فلپائن بانگسا مورو عوام کے مضبوط اتحاد اور جزائر منداناؤ، باسیلان، سولو، اور پالاوان میں بنگسا مورو وطن کی قومی یکجہتی کو تسلیم کرلے،

۲- حکومت فلپائن، منداناؤ، باسیلان، سولو، اور پالاوان پر مشتمل بنگسا مورو وطن

کی مکمل خود مختار فرمانروائی کو تسلیم کرے،

۳۔ حکومت فلپائن اپنے ملکی ڈھانچہ (Framework) کے اندر منداناؤ، سولو، باسیلان اور پالوان کی سیاسی خود مختاری کو تسلیم کرے،

۴۔ حکومت فلپائن تسلیم کرے کہ مجوزہ خود مختار خطہ کا خارجی دفاع مرکزی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہوگی، جب کہ اندرونی امن و سلامتی کا قیام خود مختار حکومت بنگسا مورو کے فرائض میں شامل ہوگا،

اس کے بعد لیبیا، سعودی عرب، جمہوریہ سنیگال اور صومالیہ کے نمائندوں پر مشتمل ایک چہار فریقی وزارتی کمیشن قائم ہوا، جس نے جنوبی فلپائن کے مسئلہ کو حل کرنے اور حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ کے درمیان مصالحت کرانے میں بہت نمایاں اور سرگرم کردار ادا کیا، بالآخر یہ مساعی بارآور ہوئیں، اور ۱۵ر سے ۲۲ر دسمبر ۷۶ء تک طرابلس (لیبیا) میں ڈاکٹر علی عبد السلام الترکی (وزیر خارجہ حکومت لیبیا) کی صدارت میں فریقین کے درمیان امن مذاکرات کا ایک اہم دور ہوا، جس میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر آٹھ روز تک غور و فکر کرنے کے بعد اتفاق رائے کے ساتھ ایک معاہدہ طے پایا، ذیل میں ہم اس کی اہم دفعات کا خلاصہ پیش کرتے ہیں؛

۱۔ جمہوریہ فلپائن کی وحدت و استحکام کے دائرے میں رہ کر جنوبی حصہ میں ایک خود مختار مسلم ریاست کا قیام،

۲۔ یہ خود مختار مسلم خطہ درج ذیل جزائر اور صوبوں سے تشکیل پائے گا؛:-

باسیلان، سولو، تاوی تاوی، زمبوانگا دیل سور، زمبوانگا دیل نورتی، ماگنداناؤ، سلطان کودارت، مورث دی کوتاباتو، لاناؤ دی نورتی، سارنگانی

کوتاباتی، لاناؤ دی سور، پالاوان، اور وہ تمام گاؤں اور شہر جو مذکورہ علاقوں میں واقع ہیں،

۳۔ خارجہ پالیسی مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہوگی،

۴۔ اس مجوزہ خود مختار مسلم ریاست میں مسلمانوں کو اپنی مخصوص عدالتیں قائم کرنے کا حق ہوگا، جن میں قانون اسلامی کے مطابق فیصلے کئے جائیں گے، مسلمانوں کو تمام عدالتوں میں بشمول سپریم کورٹ مناسب نمائندگی دی جائے گی،

۵۔ جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کو اپنے اسکول کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے کا حق حاصل ہوگا،

۶۔ مسلمان خود اپنا نظام حکومت اختیار کر سکیں گے،

۷۔ جنوبی فلپائن میں مسلمانوں کا خود اپنا مخصوص مالی اور اقتصادی نظام ہوگا،

۸۔ معدنیات مرکزی حکومت کے لئے مخصوص ہوں گے، البتہ وہ معدنی اشیاء اور ان کی آمدنی کا ایک معقول حصہ خود مختار مسلم حکومت کے لئے مقرر کر دے گی،

۹۔ اس معاہدہ پر دستخط کے معاً بعد جنگ بندی کا اعلان کر دیا جائیگا، جنگ بندی کے نفاذ کی نگرانی کے لئے حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی محاذ کی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کی جائے،

۱۰۔ مذکورہ کمیٹی کے سپرد درج ذیل امور کی نگرانی کا کام بھی ہوگا؛:-

تمام سیاسی قیدیوں کی رہائی، تمام پناہ گزینوں کی واپسی (جنھوں نے جنوبی فلپائن میں اپنے گھر بار کو مجبوراً چھوڑا) نقل و حرکت اور جلسہ جلوس کی مکمل آزادی؛

۱۱۔ جنوبی فلپائن میں خود مختار مسلم حکومت کے قیام سے متعلق آخری معاہدہ پر حکومت فلپائن، اور مورو قومی آزادی محاذ اور موتمر اسلامی کے درمیان دستخط جمہوریہ فلپائن

کے شہر منیلا میں ہوں گے،

۱۲۔ منیلا میں معاہدہ پر دستخط کے معاً بعد خود مختار خطہ میں ایک عارضی حکومت قائم ہو جائے گی، یہ عارضی حکومت (Adhock Govt) اس وقت تک کام کرتی رہے گی جب تک کہ باضابطہ منتخب شدہ اسمبلی کی حکومت تشکیل نہیں ہو پائی

اس معاہدہ کا مکمل متن بہت طویل ہے، جو امپیکٹ (لندن) اخبار العالم الاسلامی (سعودی عرب) اور دوسرے اہم اخباروں میں شائع ہوا ہے، اس پر حکومت فلپائن کی جانب سے وزارت دفاع کے انڈر سکریٹری کارمیلوس باربیرا اور مورو قومی آزادی محاذ کی طرف سے اس کے صدر نور سواری نے دستخط کئے ہیں،

جنوبی فلپائن کی اس مجوزہ خود مختار مسلم ریاست "بنگ مورو" کا کل رقبہ ۲۰ ہزار سات سو اکیس مربع کیلو میٹر ہے، اس کے باشندوں کی تعداد ستر لاکھ ہے، جس میں سے ۵۵ لاکھ مسلمان اور باقی عیسائی اور بت پرست وغیرہ ہیں، شہر زمبوانگا اس مجوزہ نئی اسلامی مملکت کا متوقع دار السلطنت ہے،

معاہدۂ طرابلس پر عملدرآمد کے سلسلہ میں صدر مارکوس کا رویہ

لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں تک حوصلہ افزا اقدامات ہو جانے کے باوجود کیا مورو ہوم لینڈ کا قیام واقعی شرمندۂ تکمیل ہو سکے گا اس بارے میں ابھی یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ صدر مارکوس کے بیانات اور اقدامات میں زبردست تضاد پایا جاتا ہے، ایک طرف وہ عالمی برادری خصوصاً اسلامی ممالک سے تحسین و ستائش حاصل کرنے کے کیلئے جنوبی فلپائن کو خود مختاری دینے کو تیار معلوم ہوتے ہیں، دوسری طرف ان کے عملی اقدامات واضح طور پر ان کے تیام امن کے ارادوں کو مشتبہ بناتے ہیں، پہلے تو صدر مارکوس نے مجوزہ خود مختار خطہ میں شامل

علاقوں میں یہ استصواب رائے کرانے کا شوشہ چھوڑ دیا، کہ یہ صوبے خود کو مجوزہ حکومت بنگسا مورو میں ملانا پسند کرتے ہیں، ؟؟؟ لیکن اس ریفرنڈم کے لئے پہلے تو بار بار تاریخیں ملتوی ہوتی رہیں، پھر جب ۲۲ اپریل ۷۷ء کو بالآخر یہ رائے شماری عمل میں آئی تو کہا گیا کہ رائے دہندگان نے اپنے صوبوں کے خود مختار مسلم خطہ میں انضمام کے خلاف ووٹ دیا ہے، مورو قومی آزادی محاذ نے اس ریفرنڈم کی تجویز کو پہلے ہی مسترد کر دیا تھا کیونکہ وہ اس نام نہاد استصواب رائے کی حقیقت اور اس کے متوقع نتیجہ سے بخوبی واقف تھے،

درحقیقت صدر مارکوس قیام امن اور معاہدۂ طرابلس کی تکمیل کیلئے سنجیدہ اور مخلص نہیں معلوم ہوتے ہیں، حالانکہ مورو قومی آزادی محاذ نے اپنے رویہ میں غیر معمولی لچک کا ثبوت دیا ہے، وہ اسلامی کانفرنس کے ایماء پر نہ صرف آزادی کامل کے مطالبہ سے دستبردار ہو گیا، بلکہ سیاسی خود مختاری کے مطالبہ میں بھی کافی کمی کر دی ہے،

صدر مارکوس کے ارادوں کے بارے میں شکوک و شبہات کو اس سے بھی تقویت ملتی ہے کہ ان کی اہلیہ مسز امیلدا مارکوس نے (جنہوں نے معاہدۂ طرابلس میں ایک اہم رول ادا کیا تھا) جب میثاق طرابلس کو طاق تعطل پر جاتے دیکھا، تو وہ بعجلت تمام کرنل قذافی سے صلاح و مشورہ کرنے کے لئے لیبیا پہونچ گئیں لیکن دوسری طرف یہاں منیلا میں صدر مارکوس نے متعدد مسلم دشمن اقدامات کا سلسلہ شروع کر دیا، مثلاً:

۱۔ مورو فوجی کمان کے خلاف ایک خصوصی فوج کی تنظیم،

۲۔ فلپائن کی مسلح افواج کی جنوبی فلپائن میں دوبارہ تعیناتی،

۳۔ درجہ فہرست علاقوں میں بری، بحری اور فضائی افواج کے محفوظ (Reserve) دستوں کا قیام،

۴۔ مجوزہ خود مختار خطّے کے لئے منظور شدہ علاقوں کے باشندوں کو خود اختیاری کے
خلاف برانگیختہ کرنا،

۵۔ مورو مسلمانوں کے درمیان نزاع اور اختلاف کی تخم ریزی،

۶۔ مورو قومی آزادی محاذ پر جنگ بندی کی خلاف ورزی کا الزام عائد کرنا،

واقعہ یہ ہے کہ جنوبی فلپائن کے انتشار اور خانہ جنگی کے باعث مسلم ممالک سے جمہوریہ
فلپائن کے تعلقات ہمیشہ سے خراب چلے آرہے تھے، اور وہ اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے
تھے، صدر مارکوس اس صورتِ حال سے سخت پریشان تھے، چنانچہ انھوں نے ان مسلم
ملکوں کی ہمدردی اور تعاون حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے جدّہ کانفرنس میں جنوبی فلپائن
کے مسلمانوں کی ایک با اختیار حکومت کے قیام کا وعدہ کیا، اور اب معاہدۂ طرابلس کے بعد
بقول کارمیلو س باربیرو (جنھوں نے اس معاہدہ پر فلپائنی وفد کے سربراہ کی حیثیت سے
دستخط ثبت کئے ہیں) "ان مذاکرات سے نہ صرف مسلم ملکوں نے فلپائن کو اپنا دوست بنالیا ہے
بلکہ اس کو آیندہ مئی میں طرابلس میں ہونے والی اسلامی وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں
بحیثیت مشاہد (Observer) مدعو بھی کیا ہے"

دوسرے یہ کہ مجوزہ خود مختار بنگسا مورو حکومت میں جو علاقے شامل کرنا طے کئے گئے ہیں
وہ بہت ہی دولتمند زرخیز، معدنی ذخائر اور مچھلیوں کی کثرت سے مالا مال ہیں، معاہدۂ طرابلس
میں مسلمانوں کے مستقل و مخصوص مالی اور اقتصادی نظام کی تجویز بھی منظور کی گئی ہے،
ظاہر ہے کہ حکومت فلپائن اتنی آسانی کے ساتھ اپنی معیشت کی اس بنیاد کو ختم کرنے پر تیار نہیں
ہوسکتی ہے، جنوبی فلپائن کے مسلم قائدین کا خیال ہے کہ مسلم ممالک خصوصاً مشرق اوسط کے
ملکوں کے مؤثر دباؤ کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، کیونکہ آج فلپائن کی ضرورت کا ۹۰ فی صد

تیل مشرق وسطیٰ ہی سے درآمد کیا جاتا ہے،

مسلم وزرائے خارجہ کی گذشتہ ماہ ہونیوالی کانفرنس نے صدر مارکوس پر معاہدۂ طرابلس سے انحراف
کا الزام عائد کرتے ہوئے اُن کی دورخی حکمت عملی پر اپنی شدید ناراضگی اور تشویش کا اظہار
کیا ہے، مارکوس کے اس رویہ کی وجہ سے کئی ماہ کی خوش آیند توقعات کے بعد فلپائن کی
صورتِ حال پھر تشویشناک اور غیر یقینی ہوگئی ہے

کرنل قذافی نے جو فریقین کے درمیان مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش تھے،
دل برداشتہ ہوکر یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اب حکومت فلپائن اور مورو قومی آزادی
محاذ اپنے مسائل سے جس طرح بھی چاہیں خود ہی نبرد آزما ہوں،

محاذ کے سکریٹری نور سواری نے بھی مذکورہ کانفرنس میں بطور مشاہد تقریر کرتے
ہوئے کہا کہ:۔

"مورو قومی آزادی محاذ کے پاس اب اس کے سوا کوئی راستہ نہیں
رہ گیا ہے کہ وہ از سرِ نو اپنی مسلح جد وجہد کا آغاز کرے، اور
مکمل آزادی کے اس مطالبہ کو پھر دہرائے، جس سے اسلامی کانفرنس
کے ایما پر وہ دستبردار ہوگیا تھا"

اب فلپائن کی تازہ ترین صورتِ حال یہ ہے کہ معاملہ کو چہار فریقی وزارتی کمیشن
کے سپرد کردیا گیا ہے، جو مورو قومی آزادی محاذ اور حکومت فلپائن کے درمیان مصالحت
کرانے کی کوشش جاری رکھے گا،

....

وفیات

مولانا محمد سلیم کیرانوی مرحوم

از عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا محمد سلیم صاحب سے میری ملاقات پہلی بار شاید قرول باغ دہلی میں ہوئی، اس زمانہ میں انھوں نے وہاں مدرسۂ صولتیہ کے تعارف اور اس کی امداد و اعانت کی غرض سے دفتر قائم کیا تھا، اور ایک ماہوار رسالہ نکالتے تھے، جامعہ ملیہ بھی اس زمانہ میں قرول باغ ہی میں تھی، اسکی وجہ سے میرا وہاں آنا جانا ہوتا رہتا تھا، خیال آتا ہے کہ دو ایک بار لکھنؤ میں بھی ڈاکٹر عبدالعلی حسنی مرحوم ناظم ندوۃ العلماء کے یہاں انھیں دیکھا تھا، یہ ملاقاتیں سرسری تھیں، گفتگو بھی زیادہ تر رسمی ہوئی، مگر مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی سے نسبت اور مدرسۂ صولتیہ کے تعلق کی بنا پر دل میں انکی غیر معمولی عزت تھی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمۃ کا مسلمانان ہند پر بڑا احسان ہے، ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط کے بعد سارا ملک عیسائیت کے نرغے میں آگیا تھا، مشنری اس زور و قوت کے ساتھ میدان میں نکل آئے تھے کہ خیال ہوتا تھا کہ کچھ ہی عرصہ میں پورا ملک عیسائی ہو جائے گا، مسلمان خاص طور سے زد میں تھے، اس زمانہ میں انگریزوں کا جو رعب اور دبدبہ تھا اس کے سامنے بڑے بڑوں کے پتے پانی ہوتے تھے، ایسی دہشت انگیز فضا میں مولانا رحمۃ اللہ علیہ الرحمۃ نے جان پر کھیل کر مقابلہ کی ہمت کی، اس زمانہ میں پادری فنڈر کا بڑا غلغلہ تھا، وہ بڑا زور آور مناظر سمجھا جاتا تھا،

حکومت کی پشت پناہی نے اسے بہت بیباک بنا دیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ نے اسے دعوت مبارزت دی، بالآخر ۱۲۷۰ھ میں آگرہ میں بہت بڑے پیمانہ پر مجلس مناظرہ منعقد ہوئی، اس موقع پر مولانا کے ساتھ ڈاکٹر محمد وزیر بھی تھے تاکہ حسب ضرورت انگریزی میں مولانا کی ترجمانی کرسکیں۔

مولانا نے بائبل کی تحریف اور نسخ پر ایسی مدلل اور موثر تقریر کی کہ پادری فنڈر لاجواب ہوگیا اس شکست نے مشنریوں کے حوصلے پست کردیے اور نصرانیت کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے، لیکن انگریزی حکومت کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی، آج آزادی کے دور میں ہم اس زمانہ کے انگریزی رعب وداب کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں، پادری فنڈر کی شکست تو بہت بڑی بات تھی، اس سے بہت چھوٹی باتوں پر دار و رسن کی نوبت آجاتی تھی، مولانا رحمۃ اللہ کو لوگوں نے اس صورت حال سے باخبر کیا، اور مشورہ دیا کہ ہندوستان سے باہر نکل جائیں، انھوں نے حجاز کا رخ کیا اور مکہ معظمہ میں سکونت اختیار کرلی، وہیں اپنی مایۂ ناز کتاب اظہار الحق تصنیف کی جو مسیحی عقائد و خیالات کی تردید میں اب تک لاجواب سمجھی جاتی ہے۔

پادری فنڈر ساری دنیا میں مشہور تھا، اس کی شکست سارے مسلم ممالک میں بڑی مسرت کے ساتھ سنی گئی اور مولانا رحمۃ اللہ رحمۃ اللہ کا نام بڑی عزت کے ساتھ لیا جانے لگا، یہ سلطان عبدالحمید کا زمانہ تھا، انھوں نے مولانا کو قسطنطنیہ بلایا، بڑا اعزاز و اکرام کیا اور خواہش کی کہ آستانۂ خلافت کے قریب قیام کریں، مگر مولانا نے ہجرت کے ثواب کو ضائع کرنا پسند نہ کیا اور سلطان سے اجازت لے کر مکہ معظمہ واپس آگئے، اس کے بعد بھی کئی بار طلب کئے گئے اور اسی خواہش کا اظہار کیا گیا مگر مولانا نے معذرت کردی اور ساری زندگی بیت اللہ کے جوار میں گذار دی، مکہ معظمہ میں انھوں نے ۱۲۹۰ھ میں مدرسۂ صولتیہ کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جس کی خدمات آج تک جاری ہیں۔

۱۳۰۸ھ میں مولانا نے وفات پائی، ان کے بعد ان کے بھتیجے مولانا محمد سعید نے مدرسۂ صولتیہ کا

انتظام اپنے ہاتھ میں لیا، جب ان کا بھی انتقال ہوگیا تو یہ خدمت ان کے صاحبزادہ مولانا محمد سلیم کے سپرد ہوئی، انھوں نے اپنی ساری زندگی اس کام میں لگادی، اس اثنا میں حجاز میں بڑے انقلاب آئے، پہلی جنگ عظیم کے بعد خلافت عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا اور ترکی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے، شریف حسین نے انگریزوں کی شہ پر ترکوں کے خلاف بغاوت کی اور حجاز میں اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی لیکن اس غداری کا انجام اچھا نہیں ہوا، ساری دنیائے اسلام نے اس حرکت پر بیزاری کا اظہار کیا، چند ہی برس میں والیٔ نجد شاہ عبدالعزیز ابن سعود نے اسے شکست دے کر حجاز سے نکال باہر کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔

یہ سارے انقلابات مولانا محمد سلیم کے سامنے ہوئے، وہ تفصیل سے اس دور کے حالات سناتے تھے، کہتے تھے کہ حرمین شریفین کے ساتھ ترکوں کو والہانہ عقیدت تھی، وہ دل سے اپنے کو خادم الحرمین سمجھتے تھے، جنگ عظیم کے زمانہ میں حرم شریف کے اندر کھڑے ہوکر شریف حسین نے انور پاشا کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا لیکن اس اقرار کے باوجود انور پاشا کے رخصت ہوتے ہی بغاوت کردی اور برطانوی حکومت کی مدد کو ترک سپاہیوں کو گولی کا نشانہ بنایا، شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا حال بھی سناتے تھے، سعودی حکومت کے آغاز سے اس وقت تک کے حالات سے بھی خوب واقف تھے اور بہت سے ایسے واقعات ان کے حافظہ میں محفوظ تھے جو تاریخ کی کتابوں میں نظر نہیں آتے۔

۱۹۶۷ء میں جب جامعہ کے بعض احباب (ارشاد الحق مرحوم، عبدالرزاق صاحب، اور سعید انصاری صاحب) کے ساتھ حج کا ارادہ ہوا تو قیام کے لئے مدرسہ صولتیہ کا خیال آیا، مولانا محمد سلیم صاحب کو اس ارادہ کی اطلاع دی اور جہاز کا نام اور تاریخ بھی لکھ دی، جب ہم لوگ جدہ پہونچے تو مولانا کے فرستادہ قاری عبدالرؤف مدینۃ الحجاج میں خوش آمدید کہنے کے لئے موجود تھے، دوسرے دن مکہ معظمہ میں مولانا سے ملاقات ہوئی تو بڑے تپاک سے ملے اور فرمایا: پوچھنے کی کیا بات تھی، صولتیہ تو مولویوں کا گھر ہے، ان کی کریم النفسی کرایہ کے ذکر سے گریز کرتی تھی، لیکن ہم لوگوں نے مدرسہ کا نقصان گوارا نہ کیا اور کرایہ ادا کردیا، تقریباً ڈھائی ماہ مکہ معظمہ میں قیام رہا، ان کے

سایہ میں یہ دن بڑے آرام سے گزرے، ان کی مجلس بڑی باغ و بہار ہوتی تھی، بات کرتے تو منھ سے پھول جھڑتے، سیکڑوں لطائف و ظرائف نوک زبان تھے قصص و امثال کی تو کوئی حد نہ تھی، بات میں بات نکلتی اور قصہ پر قصہ چھڑتا اور سامعین ایسے محو ہوتے کہ گھنٹوں گزر جاتے اور اٹھنے کا جی نہ چاہتا، ان کے معلومات و ملفوظات اگر قلمبند ہوگئے ہوتے تو بڑے دلچسپ اور مفید ہوتے، گزشتہ ساٹھ برس کی تاریخ پر ان کی نظر بہت گہری تھی، شاید ہی کوئی دوسرا شخص واقعات اور ان کے علل و اسباب سے اس قدر واقف ہو، میں نے کہا کہ یہ حالات زیر تحریر میں آجاتے تو آئندہ مورخ کے لئے بڑے کار آمد ہوتے، کہنے لگے کہ عرصہ ہوا کچھ واقعات لکھے تھے لیکن پتہ نہیں اب کہاں ہیں، ان کے صاحبزادہ مولوی محمد شمیم کو بھی ایک بار توجہ دلائی تھی، خدا کرے وہ کاغذات مل جائیں اور شمیم صاحب انھیں مرتب کرکے شائع کردیں۔

حجاج کی خدمت کا بہت شوق تھا، ان کی راحت رسانی کی پوری تدبیر کرتے تھے، ۱۹۷۴ء میں شاہ معین الدین احمد صاحب مرحوم کے ساتھ دوبارہ حج و زیارت کی سعادت حاصل ہوئی تو مولانا کی خدمت میں بھی حاضری کا موقع ملا، شاہ صاحب حضرت شاہ احمد عبدالحق رودولوی کی اولاد میں تھے جو مخدوم جلال الدین پانی پتی کے خلیفہ تھے اور مولانا محمد سلیم صاحب حضرت جلال الدین پانی پتی کی نسل سے تھے، اس رشتہ سے دونوں کو ایک دوسرے سے بہت تعلق تھا، بڑی یگانگت سے ملے اور دیر تک بزرگوں کا تذکرہ ہوتا رہا، عمر کافی ہوچکی تھی مگر نشاط طبع میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، لطف بیان اور حلاوت لسان کا وہی عالم تھا، بلبل ہزار داستان کی طرح بولتے اور چہکتے گلفشانی گفتار دیدنی ہوتی، نقاہت میں لطافت اور سنجیدگی میں مزاح کی ایسی آمیزش کم دیکھنے میں آئی ہے۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہ زبان گہربار جلد خاموش ہونے والی ہے، سال ہی بھر میں شاہ معین الدین احمد اللہ کو پیارے ہوگئے اور ان کے دو برس بعد مولانا محمد سلیم نے بھی سفر آخرت اختیار کیا، اللہ انھیں اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

مولوی محمد شمیم نے ان کی زندگی ہی میں تمام کاموں کو سنبھال لیا تھا، اللہ انھیں توفیق عطا فرمائے کہ

کہ اپنے نامور باپ کی روایات کو قائم رکھیں، ہندوستانی حجاج روزافزوں گرانی سے بے حد پریشان ہیں، متوسط طبقہ کی استطاعت روز بروز ختم ہوتی جارہی ہے، اس وقت انھیں سہارے کی ضرورت ہے، کسی زمانہ میں حرمین شریفین میں متعدد رباطیں موجود تھیں، مگر اب وہ یا تو ختم ہوگئی ہیں یا خاتمہ کے قریب ہیں، شمیم صاحب اگر حاجیوں کے لئے سستی قیام گاہوں کا انتظام کرسکیں تو ثواب دارین کے مستحق ہوں گے، اس سلسلہ میں سعودی حکومت اور ہندوستانی گورنمنٹ دونوں کی طرف سے کافی مدد مل سکتی ہے۔

مدرسہ صولتیہ کو اپنے زمانۂ قیام ہی سے بڑی اہمیت حاصل ہوگئی تھی، مولانا رحمۃ اللہ اور ان کے رفقاء کی جدوجہد نے اسے عالم اسلام کا مشہور مدرسہ بنا دیا تھا، اس کے فیض یافتگان بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور اعلیٰ مناصب پر سرفراز ہوتے تھے، ساری دنیا میں اب حالات پہلے سے بہت کچھ بدل گئے ہیں، اس انقلاب سے سعودی عرب بھی متاثر ہوا ہے، تعلیم و تربیت کے میدان میں بہت اصلاحات ہوئی ہیں اور ان کا سلسلہ اب بھی جاری ہے، ان تغیرات کی روشنی میں مدرسہ کو بھی مناسب اصلاحات کرنی ہوں گی۔

مدرسہ صولتیہ میں ایک زمانہ میں ہندوستانی طلبہ کافی جایا کرتے تھے اور تعلیم و تربیت حاصل کرکے ہندوستان کے مدارس میں تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے، اس بارہ میں خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، اس کام کے لئے ہندوستان کے اہل خیر سے کافی وظائف مل سکتے ہیں۔ اس طرح اہل ہند اس درسگاہ سے زیادہ سے زیادہ فیض یاب ہوسکیں گے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ اور مولانا محمد سلیم مرحوم کے مقاصد پایۂ تکمیل کو پہونچ سکیں گے، خدا کرے مولوی محمد شمیم کے ہاتھوں مدرسۂ صولتیہ کے ایک شاندار دور کا آغاز ہو۔

باب التقریظ والانتقاد

"ارمغانِ نعت"

از۔ ضیاء الدین اصلاحی

مرتبہ۔ جناب شفیق بریلوی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۳۶۰ مجلد، قیمت ۲۵ روپے، پتہ :۔ مکتبہ خاتون پاکستان پوسٹ بکس ۱۹۹، کراچی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو عزت، محبت، عظمت اور اہمیت مسلمانوں کے نزدیک ہے، اس بنا پر وہ آستانۂ رسالت پر اخلاص و عقیدت کا نذرانہ پیش کرنے میں وسیلۂ مغفرت خیال کرتے ہیں، اور آپ کی محبت کا حق ادا کرنے کے لیے آپکے پیام کی اشاعت کو اپنا فرض سمجھتے ہیں، اسی غرض سے سیرت نبوئی پر بیشمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔

نثرنگاروں کی طرح شاعروں نے بھی بارگاہ نبوت میں عقیدت و محبت کے پھول نچھاور کئے ہیں اور آپ کی سیرت طیبہ سے اپنے فرط تعلق کا اظہار کیا ہے، بعض شاعروں نے تو بجز نعت کے دوسری اصناف سخن سے اپنی زبان آلودہ کرنا بھی پسند نہیں کیا، اور انھوں نے اپنی مشقِ سخن اور جولانیٔ طبع کا دائرہ بس اسی مقدس صنف تک ہی محدود رکھا ہے۔

جناب شفیق بریلوی اڈیٹر ماہنامہ خاتون پاکستان کو اس صنفِ سخن سے بڑی دلچسپی ہے، ان کے رسالہ کے رسول نمبروں کا حصہ نظم گلشنِ نعت کے رنگ برنگ پھولوں سے

معطر رہتا تھا، اس میں اردو، عربی اور فارسی کا جو نعتیہ کلام شایع ہوتا رہا اب اس کو
اضافہ کے بعد "ارمغان نعت" کے نام سے مرتب کیا ہے، اس میں گذشتہ چودہ سو سال کا
منتخب نعتیہ کلام آگیا ہے، عربی فارسی اور ترکی وغیرہ میں اس طرح کے مجموعے موجود تھے لیکن
اردو میں یہ غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ بعض علاقائی
زبانوں پنجابی، سندھی، اور پشتو وغیرہ کے نعتیہ کلام پر مشتمل ہے، آخر میں بعض ہندو شعرا کا
منظوم خراج عقیدت بھی ہے۔

اس مجموعہ سے ناظرین کو متعدد نعت نگاروں کا علم پہلی بار ہوگا، صحابہ کرام میں حضرت
حسانؓ حضرت کعبؓ بن زہیرؓ، اور حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نعت گو اور مداحِ رسول کی
حیثیت سے بہت مشہور ہیں، لیکن مصنف کی محنت و جستجو سے اس میں خلفاے راشدینؓ حضرت
عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت حمزہؓ، حضرت عباسؓ اور حضرت ابو سفیانؓ بن حارث کے
علاوہ آپ کے شفیق و غمگسار چچا ابو طالب کے نعتیہ ترانے بھی ملیں گے، اور امام زین العابدینؒ
اور علامہ بوصیری کی طرح امام ابو حنیفہؒ علامہ ابن خلدونؒ اور شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ کی نعتوں
کی سوغات کو بھی شامل کیا گیا ہے، عربی نعت نگاروں کی بزم قدس میں ہندوستان کے شاہ ولی اللہ
دہلوی، آزاد بلگرامی، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالعزیز اور ابو طاہر سیف الدین بھی
نظر آتے ہیں، فارسی نعت گویوں میں بھی ہندوستانی شعرا کی فہرست طویل ہے اردو
کے نعت گو شاعروں کی صف میں کئی ایسے نام نظر آتے ہیں جن کی شہرت اور دوسری
حیثیتوں سے ہے مگر جناب شفیق کی تلاش سے مولانا اسماعیل شہیدؒ، مولانا قاسم نانوتویؒ
حاجی امداد اللہ مہاجر کیؒ، مولوی اسماعیل میرٹھی، سردار عبدالرب نشتر، مولانا ابوالکلام
آزاد اور مولانا مفتی محمد شفیع وغیرہ کی نعتیں بھی جمع ہوگئی ہیں مصنف نے طوالت کے

خوف سے ہر شاعر کی صرف ایک ہی نعت پر اکتفا کی ہے، اور بعض طویل نعتوں کا انتخاب
دیا ہے، شاعروں کے سنین وفات بھی دئے گئے ہیں، اسی اعتبار سے ان کے ناموں کی ترتیب
بھی ہے۔

نعت گوئی کے لئے دل کی مستی و سرشاری اور دماغ کی ہوشیاری و بیداری دونوں
ضروری ہیں، کیونکہ اس میں آنحضرت صلعم کی ذات اقدس کی محض تعریف و توصیف ہی
نہیں ہوتی، بلکہ یہ آپ کے اوصاف و کمالات کی ایسی مصوری کا نام ہے جس سے ایمان
میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا ہو، اس لیے ایک نعت گو شاعر کو حبِ رسول
میں سرشار ہونے کے ساتھ ہی نبوت کے اصلی کمالات اور کارناموں، اسلام کی
صحیح روح، عہد رسالت کے واقعات اور آیات و احادیث سے بھی واقف ہونا
ضروری ہے تاکہ وہ افراط و تفریط سے بچ کر احتیاط اور جذبۂ احترام کے ساتھ بارگاہ
رسالت میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کر سکے، اس کے بغیر ہر قدم پر لغزش کا امکان
رہتا ہے، اور اس راہ میں ادنیٰ لغزش سے ساری نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، یہی وجہ
ہے کہ بڑے بڑے شعرا بھی اس نازک مقام پر لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر ۔۔۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اور عرفی جیسے شاعر کو بھی یہ کہنا پڑا:

عرفی مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحراست ۔۔۔ آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را
ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن ۔۔۔ نعتِ شہ کونین و مدیح کے و جم را

بعض نعت گو شعرا الوہیت و نبوت کے حدود میں فرق نہیں کرتے، وہ نبوت
کو الوہیت سے ملا دیتے ہیں، اس افراط و غلو کے مقابلہ میں دوسری طرف تفریط

دسوادب کا یہ حال ہے کہ بعض شاعر نبوت کی ذات پاکؐ کے ساتھ عقیدت و محبت کے اظہار کے لیے وہی پیرایہ اختیار کرتے ہیں، جو عشق مجازی کے معشوقوں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے، درحقیقت آپکی ذات مبارکؐ میں نبوت و عبدیت دونوں کے کمالات ختم ہوگئے ہیں، اس لیے جو تصور بھی ان کے منافی ہوگا، اس کا انتساب آپ کی جانب گمراہی ہے، اس مجموعہ کی خوبی یہ ہے کہ اس کی اکثر نعتیں جوش عقیدت سے لبریز ہونے کے باوجود افراط و تفریط سے خالی ہیں، نبوت کی عظمت و جلالت اور خصائص محمدیؐ کے بیان میں الوہیت کی تقدیس و تنزیہ کو مدنظر رکھا گیا ہے، درج ذیل عربی، فارسی اور اردو کے ایک ایک شعر سے اس کا اندازہ ہوگا۔

دع ما ادعتہ النصاری فی نبیھم | واحکم بما شئت مدحا فیہ واحتکم
(بوصیری)

صرف وہ بات چھوڑ دو جس کا دعوی نصرانیوں نے اپنے نبی کے بارہ میں کیا ہو، اس کے علاوہ جو تمھارا جی چاہے حضورؐ کی مدح میں کہو،

مخواں او را خدا از بہر امر شرع و حفظ دیں | دگر ہر وصف کش می خواہی اندر مدحش املا کن
(شاہ عبدالحق)

فرشتے قبر میں پوچھیں گے گر مجھ سے تو کہدوں گا | کہ ہوں بندہ خدا کا اور ہوں شیدا احمدؐ کا

اکثر نعتیں آیات و احادیث، اسلامی تاریخ کے واقعات کی تلمیحات، دینی حرارت، اسلامی روح اور شاعرانہ لطافتوں سے معمور ہیں۔

شاعروں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ ان کے نام تحریر کرنے اور نمونے کے اشعار نقل کرنے کی گنجائش نہیں، ناظرین معارف کی دلچسپی کے لیے یہ لکھنا کافی ہوگا کہ علامہ شبلی نعمانیؒ، معارف کے مدیر اول مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولوی اقبال احمد خان سہیل کا نعتیہ کلام بھی اس میں موجود ہے۔

شروع میں پاکستان کے مشہور عالم اور ندوہ کے لائق فرزند مولانا عبد القدوس ہاشمی ندوی کے قلم سے ایک پرمغز مقدمہ ہے، اس میں نعت کے لغوی و اصطلاحی معنی بتانے کے بعد عربی، فارسی، ترکی اور اردو میں اس کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، مولانا نے بڑی تحقیق و کاوش سے یہ ثابت کیا ہے کہ نعت کی ابتدا عہد نبوت ہی میں ہو چکی تھی، اس ضمن میں بائیس۲۲ نعت گو صحابۂ کرام کے نام اور ان کے ایک ایک شعر بھی دیے ہیں، بعد کی صدیوں میں جن عربی شاعروں نے اس فن کی جانب زیادہ توجہ کی تھی، ان کی بھی فہرست دی ہے، فارسی، ترکی اور اردو کے بھی اہم نعت گو شاعروں کے نام اور بعض کے کلام کی خصوصیات کا بھی ذکر ہے، پندرہ۱۵ صفحے کا یہ مقدمہ بڑی تحقیق و محنت سے لکھا گیا ہے، پاکستان کے ایک اور صاحب علم و قلم مولانا سید حسن مثنیٰ ندوی نے وہ سب آیتیں اکٹھا کر دی ہیں جن میں رسول اللہؐ کی نعت و منقبت اور آپ کے خصائص و کمالات بیان ہوئے ہیں۔

ہندی میں بھی نعتیہ شاعری کا اچھا ذخیرہ موجود ہے، پنجابی، سندھی اور پشتو وغیرہ کی طرح اس کا بھی انتخاب اردو رسم الخط میں ہو جاتا تو مناسب تھا، حضرت خواجہ گیسو دراز، محمد قلی قطب شاہ، ممتاز جہان گنگوہی، مولانا مناظر احسن گیلانی اور کبیر داس کی نعتیہ نظمیں ہندی اور پوربی ہی میں ہیں، لیکن ان کو اردو میں خلط ملط کر دیا گیا ہے، ایسے مجموعہ میں استیعاب و استقصا بہت مشکل ہے، مصنف کی کوشش کے باوجود بعض اچھے نعت گو شاعروں کا کلام رہ گیا ہے، ایسے نام جو اس وقت ذہن میں آگئے ہیں وہ یہ ہیں، شاہ محمدی بیدار دہلوی، سرسید احمد خاں راسخ عظیم آبادی، انیق جونپوری، شفیق جونپوری، احسان شاہجہاں پوری، اصغر حسین لدھیانوی، اثر صہبائی، خواجہ

عزیز الحسن مجذوب، الم مظفر نگری، یحییٰ اعظمی، عبدالکریم ثمر، وفا براہی وغیرہ
ہند وشعرا کی فہرست میں بھی بعض نام رہ گئے ہیں، آخر میں موجودہ شاعروں کا نعتیہ
کلام درج ہے، لیکن اس میں بھی ہندوستان کے اکثر جدید شعرا نظرانداز ہو گئے
ہیں، ممکن ہے گذشتہ کئی برسوں سے دونوں ملکوں کے درمیان کتابوں اور رسالوں
کے آنے جانے کی بندش اس کا سبب ہو،

بعض مرحوم شعرا کے نام زندوں کی فہرست میں آئے ہیں، آغا شورش کاشمیری
اور مولانا مفتی محمد شفیع کا تو حال ہی میں انتقال ہوا ہے، لیکن حمید صدیقی، اور تسکین قریشی کب کے
وفات پا چکے ہیں، سنین وفات میں بھی کہیں کہیں غلطی ہے، جیسے اقبال سہیل کا سنہ
وفات ۱۹۴۵ء لکھا ہے، حالانکہ صحیح ۱۹۵۴ء ہے، غالباً کتابت کی غلطی سے اکبر میرٹھی کی
نظم میں معراج کو مذکر (ص ۱۴۵) اور سردار عبدالرب نشتر کی نظم میں اسکو جمع استعمال
کیا گیا ہے، عربی شعروں میں اعراب کی غلطیاں بہت ہیں، پتہ نہیں علامہ شبلی کی سیرۃ
النبی کے سرنامہ کی عبارت میں تصرف کیوں کر دیا گیا ہے،

علامہ شبلی کی اصل عبارت یہ ہے۔

"ایک گدائے بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص وعقیدت کی نذر لے کر آیا ہے"
مگر اس کو اس طرح نقل کیا گیا ہے،

"ایک فقیر بے نوا شہنشاہ کونین کے دربار میں عقیدت کے گہر ہائے آبدار لے کر حاضر ہوا ہے"
ان فروگذاشتوں سے "ارمغان نعت" کی قدر و قیمت میں فرق نہیں آتا، مرتب نے بڑی محنت اور
عقیدت سے نعتوں کا یہ گلدستہ سجایا ہے، دربار رسالت میں انکی عقیدت کا یہ نذرانہ رائگاں نہ جائیگا۔ دینی خدمت
قطع نظر یہ ایک مفید ادبی خدمت بھی ہے جسکے لیے ارباب ذوق کو مرتب کا شکر گذار ہونا چاہئے، باطنی
محاسن کی طرح کتاب کی ظاہری سج دھج بھی دیدہ زیب اور دلکش ہے۔

مطبوعات جدیدہ

محاسن موضح القرآن ۔ از ۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی، تقطیع کلاں کاغذ کتابت
بہتر، صفحات ۔ ۲۶۵، قیمت ۔ ے ۱۵/ پتہ ۔ ادارۂ رحمت عالم شیخ چاند اسٹریٹ
لال کنواں دہلی ۔

حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کا ترجمہ قرآن اور ان کے مختصر تفسیری حواشی محتاج تعارف
نہیں ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں انھوں نے موضح القرآن کے نام سے یہ کام مکمل کر لیا تھا اسکے
بعد بہت سے لوگوں نے اس کی نقلیں لیں، اور جب چھاپے خانے قائم ہوئے تو لاکھوں کی تعداد
میں اس کے نسخے شایع ہوئے، اور اب تک اس کا سلسلہ جاری ہے، تقریباً دو صدیاں گزر چکی
ہیں، مگر شاہ صاحب کے کارنامہ کی آب وتاب میں کوئی فرق نہیں آیا، اس طویل عرصہ میں
اردو کا اسلوب بیان بہت بدل گیا ہے، الفاظ ومحاورات میں بھی کافی تغیر ہو چکا ہے، لیکن
بایں ہمہ شاہ صاحبؒ کے ترجمہ اور تفسیر کی مقبولیت بدستور ہے، اردو میں ترجموں کی کوئی کمی
نہیں ہے، بڑے بڑے صاحب نظر عالموں اور چوٹی کے زبان دانوں نے ترجمے کئے ہیں، مگر
واقعہ یہ ہے کہ کوئی ترجمہ شاہ صاحب کے ترجمہ کے پاسنگ کو بھی نہیں پہونچتا، شاہ صاحب نے مطالب
قرآنی کا صرف مفہوم ادا کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ قرآنی الفاظ کی وسعت، جامعیت
اور ہمہ گیری کو بھی ترجمہ میں باقی رکھنے کی کوشش کی ہے، مثلاً کل یعمل علی شاکلتہ
کا ترجمہ کیا ہے، ہر ایک کرتا ہے، اپنے ڈول پر ۔ دیکھئے شکل اور شاکلہ میں جو رعایت لفظی ہے،

دہی ڈیل اور ڈول میں ہے، رویا کا ترجمہ خواب کے بجائے دکھاوا کیا ہے، دکھاوا میں خواب
کا مفہوم بھی ہے، اور مشاہدہ کا بھی، اسی طرح بعزۃ فرعون کا ترجمہ فرعون کے اقبال سے
کتنا برمحل ہے،

تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے، محاسن موضح القرآن میں آپ کو بکثرت مثالیں ملیں گی
شاہ صاحب کے ترجمہ کی یہی خوبیاں ہیں جن کی بنا پر امتداد زمانہ کے باوجود آج بھی وہ ہاتھوں ہاتھ
لیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ تصحیح کا خاطر خواہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے ترجمہ اور تفسیری
حواشی میں بہت تغیر ہو گیا ہے، اس صورت حال سے سبھی کو ملال تھا، مگر کسی کو اتنے بڑے
اور اہم کام میں ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، یہ سعادت اللہ نے مولانا اخلاق حسین قاسمی کی
قسمت میں لکھی تھی، وہ اپنی بے مائگی، اور تہی دستی کے باوجود اس عظیم الشان کام کے لیے
اٹھ کھڑے ہوئے، عرصہ سے اس کام میں لگے ہیں، تلاش وتحقیق کے بہت سے مراحل طے کر چکے
ہیں، اور ایک صحیح نسخہ ایڈٹ کر کے ترجمہ اور تفسیری فوائد (موضح القرآن) شایع
کرنے کی فکر میں ہیں، پیش نظر کتاب کو اس کا مقدمہ سمجھئے، اس نام سے ایک مختصر کتابچہ
پہلے شایع ہو چکا ہے، اس پر تبصرہ بھی ان سطور میں ہو چکا ہے، اب مزید اضافہ کے
ساتھ اسے شایع کیا ہے، یہ کتاب تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں اردو تراجم کی
عمومی تاریخ کے ساتھ شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کے حالات اور موضح القرآن کے قلمی اور
مطبوعہ نسخوں کا مفصل ذکر کیا ہے، اور کس کس طرح اس میں تحریف ہوئی اسے وضاحت
سے بیان کیا ہے، دوسرے باب میں شاہ صاحب کے ترجمے اور تفسیر کے محاسن بیان کیے ہیں
اور جا بجا دوسرے مترجمین سے مقابلہ کر کے شاہ صاحب کے کمالات کی تشریح کی ہے،
تیسرے باب میں متروکات ذکر کیا ہے، اور مشکل الفاظ کے معانی بیان کیے ہیں، امید ہے کہ

اس کتاب کے مطالعہ سے شاہ صاحب کے ترجمہ وتفسیر کے محاسن نظر کے سامنے آجائیں گے اور
اس محنت کا اندازہ بھی ہو جائے گا، جو مولانا اخلاق حسین صاحب اس کی تصحیح واشاعت
کے لیے کر رہے ہیں،

سرسید کی صحافت۔ مرتبہ ڈاکٹر اصغر عباس صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ،
کتابت وطباعت بہتر صفحات ۲۹۰ مجلد قیمت عام اڈیشن لعہ ڈی لکس اڈیشن
۲۵ روپے پتہ انجمن ترقی اردو ہند، دلی،

سرسید احمد خاں مرحوم کا ایک بڑا کارنامہ صحافت بھی ہے لیکن ان کے اور کارناموں
کی طرح ابھی تک اس پر کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، سرسید ہال کے لائق وارڈن ڈاکٹر
اصغر عباس نے یہ کتاب لکھ کر یہ کمی پوری کر دی، یہ دراصل ان کا وہ تحقیقی مقالہ ہے، جس پر ان کو
پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری ملی ہے، یہ آٹھ ابواب اور چار ضمیموں پر مشتمل ہے، پہلے باب میں سرسید احمد
خاں مرحوم کے حالات وسوانح درج ہیں، اس میں ان کے عہد و ماحول کی تصویر اور ان کے
ملی، قومی اصلاحی، تعلیمی اور ادبی خدمات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے، دوسرے باب میں سائنٹفک
سوسائٹی کے اغراض ومقاصد، اس کے اشاعتی پروگرام، اور اس سے وابستہ اشخاص کا ذکر
ہے، چند ابواب میں سرسید کے اخبار انسٹی ٹیوٹ کی غایت، اس کے سائز، ہیئت، قیمت،
تاریخ و روز اشاعت کارکنوں، خبروں کی نوعیت مضامین واداریوں کی ترتیب اور ان کی
خصوصیات کا مفصل جائزہ لیا گیا ہے، ان ابواب سے اخبار کی اہمیت اور اس کے متعلق ضروری
معلومات کے علاوہ خود سرسید احمد خان کی عظمت اور ان کے بلند عزائم ومقاصد کا بھی
اظہار ہوتا ہے آخر کے تین ابواب میں گزٹ کے کئی اہم مضمون نگاروں کے مختصر سوانحی
خاکے اور اس میں شایع شدہ سرسید کے مضامین کی روشنی میں ان کے اسلوب تحریر کی

نمایاں خصوصیات اور اردو صحافت پر ان کے اثرات دکھائے گئے ہیں، ضمیموں میں سائنٹفک سوسائٹی کے اصول و ضابطے اور ان کتابوں کے نام مع مصنفین و تاریخ اشاعت دے گئے ہیں، جن پر گزٹ میں تبصرے شایع ہوئے ہیں آخری ضمیمہ میں ناگری سے متعلق سرسید کا ایک مختصر مگر اہم مضمون درج ہے، یہ آج بھی ان لوگوں کے لئے قابل غور ہے، جو اردو رسم الخط بدلنے اور اسکو ناگری میں تبدیل کرنے کی تجویزیں پیش کرتے رہتے ہیں، کتاب محنت اور سلیقہ سے لکھی گئی ہے، اور اس سے سرسید کی صحافت کے مختلف پہلو اور خصوصیات سامنے آگئی ہیں، مصنف کی تحریر میں شائستگی اور بیشتر خیالات میں اعتدال ہے، جہاں انھوں نے پیشرو مصنفین سے اختلاف کیا ہے وہاں بھی انکی رائے مدلل اور متین ہے، ایک جگہ انکی تردید کیگئی ہے کہ مولانا شبلی نے سرسید اور انکے مذہبی خیالات سے اختلاف کی وجہ سے علیگڈھ چھوڑا تھا، مگر مصنف نے ان داخلی و خارجی اسباب کی نشاندہی نہیں کی جو مولانا کے علیگڑھ چھوڑنے کا باعث ہوئے تھے (ص ۱۶۹، ۱۷۰) شبلی کے عام ناقدین کی طرح وہ بھی انکو تمامتر علیگڈھ کا ساختہ پرداختہ سمجھتے ہیں جو صحیح نہیں، انھوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے (ص ۱۳۰) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس تحریک کا غور سے مطالعہ نہیں کر سکے ہیں وجوہات ص ۱۳۸ اکابرین (ص ۱۱۳) جمع الجمع ہے جو صحیح نہیں، روابط اثرات (ص ۱۹) ڈگزٹ (ص ۲) کو مونث لکھنا بھی صحیح نہیں ہے، بعض جملے بھی غلط ہیں جیسے انھیں خانقاہ مظہری کے مشہور بزرگ شاہ غلام علی سے بیعت تھی (ص ۲۶) کیونکہ یہ جن حلقوں کا ممدوح بنا وہی زندگی کے دھارے کا رخ موڑنا جانتا تھا" (ص ۳۶) ان کے دلوں میں زندگی کرنے کا ایک نیا حوصلہ ... (ص ۱۵۱) ایک جگہ صنعاء یمن کا اصنعائی یمن (ص ۳۱) لکھا ہے، امید کہ اس اچھی اور مفید کتاب کے آیندہ اڈیشن میں اس قسم کی فروگذاشتیں درست کر لی جائیں گی۔ (ض))

جلد ۱۲۱ ماہ رمضان المبارک سنہ ۱۳۹۷ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۷۷ء عدد ۳

مضامین

مقالات